فیض الدین احمد *

طغیانیِ رودِ موسی: اردو شاعری میں سانحات کے اظہار کی روایت کا ایک گم شدہ باب

اکثر مؤرخین اور ماہرین آثارِ قدیمہ اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ کرۂ ارض کی تمام تہذیبوں کا جنم بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے پر ہوا۔ انھی دریاؤں کے پانی سے ان تہذیبوں کی آبیاری ہوئی۔ وہیں کے چڑھتے سورج سے ان کو بینائی ملی اور وہیں کی آب وہوا نے تاریخ کو گویائی دی۔[۱] ہندوستان کے شہر حیدرآباد دکن کی تہذیب نے مشہور ندی ''رودِ موسی''[۲] کے کنارے جنم لیا۔ اس ندی کے کنارے بسنے والے لوگ آج بھی اپنی بود وباش اور طرزِ زندگی کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے مزاج میں نہ لکھنؤ والوں کا سا تکلف ہے اور نہ ہی دہلی والوں کا شاہانہ انداز بلکہ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس مٹتی ہوئی تہذیب کی سادگی اور بانکپن میں کچھ ایسی خاص بات ہے جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔[۳] اس شہر کی خوش حالی جس کے چرچے برِ عظیم کے دور دراز شہروں تک سنے جاتے تھے۔ یہ خوش حالی اچانک طغیانیِ رودِ موسی کی وجہ سے بد حالی میں تبدیل ہو جاتی ہے،[۴] جو بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی تاریخ بالخصوص حیدرآباد دکن کی تاریخ کا افسوس ناک سانحہ ہے۔

بیسویں صدی عیسوی اپنے آغاز ہی سے بے شمار ہنگامے ساتھ لائی لیکن اس عظیم سانحے کے نتیجے میں حیدرآباد دکن کی حسرت ناک تباہی نے ہزاروں کی تعداد میں ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ بے تحاشا املاک کو بھی

نقصان پہنچایا۔اس طغیانی نے شہر کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھا دیا اور لوگ مدتوں اس سانحے کو اپنے ذہن سے محو نہ کر پائے۔موسی ندی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔اس ندی نے دو سو برس تک بہمنی سلطنت کے تابناک سورج کو ابھرتے اور ڈوبتے دیکھا۔اس نے کم و بیش دو صدیوں تک قطب شاہی دور کے پُرسکون لیل و نہار دیکھے اور آخر میں اس ندی نے سلطنت آصفیہ کا وہ درخشندہ دور بھی دیکھا جس سے برِ عظیم کے دیگر شہروں کی آنکھیں چکا چوند تھیں۔[5] یہ ندی شہر حیدرآباد سے پچاس میل کے فاصلے پر 'وقارآباد' کی مشرقی پہاڑوں میں موضع راکم چرلہ کے پاس سے نکلتی ہے اور شمال مغرب کی جانب سے شہر میں داخل ہو کر کئی میل تک آبادی میں بہنے کے بعد مشرق کی طرف سے باہر نکل جاتی ہے۔[6] یہ حیدرآباد دکن کی خاص ندی ہے جسے رودِ موسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ریاست حیدرآباد کے ایک وسیع خطۂ ارض کو سیراب کرتی ہوئی یہ ندی شہر کے بیچوں بیچ سے گذر کر دریائے کرشنا سے جا ملتی ہے۔[7] یہی ندی شہر کو دو حصوں میں بانٹتی ہوئی قدیم و جدید حیدرآباد میں تقسیم کرتی ہے۔[8] اس ندی کا نظارہ نہ صرف مقامی لوگوں کے لیے فرحت انگیز ہے بلکہ دور دراز سے آنے والے سیاح بھی رودِ موسی کے ساحل کے نظارے،اس کی خوش گوار فضا اور پر کیف مناظر کو دیکھ کر اس کے حسن میں کھو جاتے ہیں۔بہت سے شعرا نے ان مناظر کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ظفر علی خاں قیامِ حیدرآباد کے دوران اس ندی کے حسن اور دل کشی کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

کس شان و تمکنت سے بہتی ہے نہر موسی   لہرا رہی ہے ناگن یا جلوہ گر پری ہے
جاں بخش تیری لہریں دل کش تیری [کذا: تری] روانی   قدرت نے تجھ کو بخشی کیا شانِ دل بری ہے[9]

حیدرآباد دکن کے باسیوں کے دلوں میں اس ندی کی قدامت اور تاریخی حیثیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فخر الدین ارمان کا بیان ہے کہ:

رودِ موسی رودِ موسی تیرا یہ دل کش سماں   تجھ میں ہے حبِ وطن کا جذبۂ آبِ رواں
ہے دکن میں بادشاہی دور کا آغاز تو   اک زمانے سے رہا ہے ہمدم و ہم ساز تو
ہاں بھٹکتے قافلے کا تو ہی خضرِ راہ ہے   تو ہماری آصفی تاریخ سے آگاہ ہے
تیرا ہر قطرہ تمنا، آرزو، ارمان ہے   ہر نفس میں تیرے زندہ باد یا عثمان ہے[10]

گرمی اور سردی دونوں موسموں میں یہ ندی پایاب رہتی ہے۔آبادی میں اس کی گذرگاہ کی حدود چار

سوقدم سے زیادہ نہیں لیکن ندی کا پاٹ ہمیشہ اسّی سے نوے قدم کا ہوتا ہے البتہ موسم برسات میں بعض اوقات اس کا پاٹ دوڈھائی سوفٹ تک ترقی کرجاتا ہے۔[11] اس ندی کے شمال اور جنوب کی آبادی کو باہم ملانے کے لیے وقتاً فوقتاً چار پل تعمیر کیے گئے تھے۔ ''پرانا پل'' جوان چاروں پلوں میں سب سے قدیم اور زیادہ مستحکم ہے، ۱۵۹۳ء میں بعہد سلطان قطب شاہ تعمیر ہوا۔ اس کے بعد غفران منزل نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد میں کرنل آئی فوٹ کے حسنِ اہتمام سے ۱۸۳۱ء میں ''چادر گھاٹ'' کا پل بنا۔ ۱۸۶۰ء میں بعہد نواب افضل الدولہ پرانے پل اور چادر گھاٹ کے پل کے درمیان ''افضل گنج'' کا پل تعمیر ہوا۔ اس کے بعد سن ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۹۰۰ء میں مسلم جنگ لائق الدولہ غالب الملک نے کثیر رقم خرچ کرکے افضل گنج کے پل کے درمیان ایک اور پل تعمیر کرایا جو ''مسلم جنگ'' کے نام سے مشہور ہوا۔[12]

قدیم دور میں اس ندی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ ایک فرانسیسی سیاح نے اسے ''قروا ندی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مانک راؤ وٹھل راؤ کا کہنا ہے کہ مؤرخ گلزار آصفیہ نے اسے ''عیسیٰ ندی'' کہا۔[13] لیکن یہ بات درست نہیں کیونکہ گلزار آصفیہ میں واضح طور پر اس ندی کا نام ''دریائے موسیٰ''[14] درج ہے۔ بعض نے اسے ''ساکل'' اور ہندوؤں میں پڑھے لکھے اور مذہبی علم سے مذاق رکھنے والوں نے اس ندی کو ''موچ کندا ندی'' کے نام سے پکارا ہے۔[15] حیدرآباد دکن کے آباد ہونے سے اب تک تقریباً دس دفعہ موسیٰ ندی میں ایسی طغیانی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقررہ حدود سے آگے بڑھی اور کنارے کے مکانوں اور محلوں پر اپنا تسلط قائم کرکے انھیں برباد کردیا۔[16]

موسیٰ ندی میں آنے والا پہلا سیلاب جس کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے، وہ ۷ صفر ۱۰۴۱ھ بمطابق ۱۶۳۱ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں آیا جس میں شاہی باغ جو نواحِ شہر میں واقع تھا، تباہ و برباد ہوگیا۔[17] اس دوران چار ماہ تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور ۷ صفر روز چہارشنبہ کو طغیانی کے نتیجے میں سیلابی ریلا پرانے پل کے اوپر سے بہنے لگا اور پانی شہر کے اندر داخل ہوگیا۔[18] ۱۰۷۹ھ بمطابق ۶۹-۱۶۶۸ء میں بھی بعہد عبداللہ قطب شاہ، طغیانی ہوئی اور دو ہزار کے قریب مکانات اس طغیانی میں بہہ گئے جب کہ لاتعداد لوگ سیلاب کی نذر ہوگئے۔[19] ۱۴ شعبان ۱۰۹۸ھ بمطابق ۱۶۸۷ء کو سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بے ہنگام بارش سے ایک بار پھر طغیانی ہوئی۔ اس وقت اورنگ زیب عالمگیر قلعہ گول کنڈہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔

طغیانی سے ان کی فوج اور سامان جنگ کو سخت نقصان پہنچا۔[۴۰] نعمت علی خاں عالی نے اُس عہد میں تباہی گول کنڈہ پر جو پُر سوز شہر آشوب لکھا اس میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے:

دریں ملک خراب امروز کس را نیست سامانی — چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانی
طبیب از علم طب دریا دلی دارو ہمی معنی — نہ باشد خوب تر از شربت دینار در مانی
صدائے ماتمی از خانہ برخاست پرسیدم — چہ شد گفتند در ایں خانہ دارو گشت مہمانی[۴۱]

اس کے بعد ۱۱۵۰ھ بمطابق ۳۸–۱۷۳۷ء روز جمعہ کو بعہد نواب آصف جاہ شدید طغیانی سے شہر کی فصیل کئی جگہ سے ٹوٹ گئی اور پانی شہر کے جنوبی حصے میں داخل ہو گیا۔[۴۲] ۱۷۴۸ء میں بھی اس ندی میں ایک بڑا سیلاب آیا اور انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔[۴۳] ۱۱۸۰ھ بمطابق ۱۷۶۸ء میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں بھی اس ندی میں بڑی طغیانی ہوئی جس سے کافی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد ۷ ربیع الثانی ۱۱۸۵ھ بمطابق ۱۷۷۱ء روز جمعہ کو نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں طغیانی کے نتیجے میں شہر پناہ کی دیوار مغربی جانب سے منہدم ہو گئی۔ تمام فصیل مغربی اور جنوبی سیلاب میں بہہ گئی۔ ہزار ہا مضبوط و مستحکم مکانات منہدم ہو گئے۔[۴۴] اور تقریباً دو ہزار افراد اس طغیانی کی نذر ہو گئے۔[۴۵]

۱۲۲۴ھ، ۱۸۰۹ء اور ۱۲۳۷ھ–۲۲–۱۸۲۱ء میں بعہد نواب سکندر جاہ کثرت بارش کی وجہ سے رود موسیٰ میں ایسی طغیانی آئی کہ بہت سے مکانات ایک بار پھر غرق آب ہو گئے۔[۴۶] ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ بمطابق ۱۸۲۹ء روز دوشنبہ کو بعہد نواب ناصر الدولہ، زبردست طغیانی کے نتیجے میں پرانے پل کے قریب فصیل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور پانی شہر میں داخل ہو کر دکانوں اور گھروں میں گھس گیا۔[۴۷] سید خورشید علی نے سہواً اس طغیانی کا سن ۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۰ء لکھا ہے۔[۴۸] کیونکہ نواب ضرغام الدولہ کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا لہٰذا اپنی فارسی مثنوی میں انھوں نے اس سانحے کی مادۂ تاریخ نکالی ہے۔

خدا ایں شہر را مامون بدارد — ز آفات چنیں مصئون بدارد
دعائے بے نظیر ایں است دایم — رئیس شہر باشد حیّ و قایم
مادۂ تاریخ ۱۲۴۵ھ طغیانیِ موجِ موسیٰ[۴۹]

اس طغیانی کے نتیجے میں بازار عنبر، چیلہ پورہ، بازار گھانسی، بازار کوکہ اور حوض چار محل وغیرہ غرق آب ہو گئے اور ان محلوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ اس طغیانی کے باعث پل قدیم کے دروازے کا ایک تختہ جو آہن

پوش تھا اور سیکڑوں منوں کا وزن رکھتا تھا، باغ امین الملک میں جا گرا اور ہزارہا آدمی ہلاک ہوئے۔[۳۰] نواب ضرغام الدولہ نے اپنی فارسی مثنوی میں اس طغیانی کی تباہی کا نقشہ موثر انداز میں پیش کیا ہے:

بعہد ناصرالدولہ بہادر شدہ دریائے موسی دفعتہ پر
بہ نصف اللیل طغیاں کرد موسی   خرابی ہا نمایاں کرد موسی
غریق بحر آفت کارواں شد   مکانِ شوخ ہرجا بے نشاں شد
ہمہ ضائع شدہ باغ امین است   درختاں گشتہ ہموارِ زمین است
در و دیوار باغ میر عالم   شدہ ضائع ازاں سیل دمادم
سرانجام اثاث البیت مردم   ہمہ تاراج تا بازار بیگم
مثالِ شیشہ ریزہ چوڑی بازار   ز بے سرمایہ گی مردم در آزار
ہمہ بازار گھانسی بے نشاں شد   خس و خاشاکِ آنجا ہم نہاں شد
جگر ہائے رحم حال خلق است   بہر صورت تلف اموالِ خلق است[۳۱]

یہ ایک طویل مثنوی ہے جسے پڑھ کر اس سانحے کی ہولناک تباہی کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ۱۲۶۵ھ بمطابق ۱۸۴۹ء کو بعہد نواب ناصرالدولہ ایک بار پھر رودِ موسی کو طغیانی ہوئی۔ کناروں پر جو مکانات تھے، گرتے رہے اور ندی کا پانی ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک بلند ہو گیا۔[۳۲] ۲۲ رمضان ۱۲۶۷ھ بمطابق ۱۸۵۱ء کو بھی رودِ موسی کو طغیانی ہوئی۔ قدیم پل پر جو چند افراد غفلت اور دھوکے میں رہ گئے تھے، نذرِ سیلاب ہو گئے۔[۳۳] ۲۹ محرم ۱۲۷۵ھ بمطابق ۱۸۵۱ء کو شدید بارش کے باعث رودِ موسی میں طغیانی کے نتیجے میں بیگم بازار کولسہ واڑی کے بہت سے مکانات منہدم ہو گئے۔ محلہ محبوب شاہی واقع چار محل کو سخت نقصان پہنچا۔[۳۴] سید خورشید علی کے مطابق اس طغیانی سے بہت کم نقصان ہوا۔[۳۵] لیکن مانک راؤ وٹھل راؤ کا کہنا ہے کہ:

> کنارے پر رہنے والے غربا کے جس قدر مکانات تھے وہ تمام منہدم ہو گئے۔ اس کی تعمیر و ترمیم وغیرہ کے لیے ۱۳۱۴ (فاطمی کیلنڈر) میں سرکار نے انھیں دو لاکھ روپے کی امداد عطا فرمائی۔ منہدم شدہ مکانات کی تعداد ۳۰۶ تھی۔ اور نقصان کا اندازہ تقریباً ۵ لاکھ کیا گیا تھا۔[۳۶]

نجم الغنی خاں نے سہواً اس سانحے کا سن اکتوبر ۱۹۰۲ء لکھا ہے۔[۳۷] جب کہ یہ واقعہ ۱۹۰۳ء میں پیش آیا تھا۔[۳۸]

یہ تو تھی رودِ موسی کی مختصر تاریخ اور وقتاً فوقتاً پیش آنے والی طغیانی کی روداد۔لیکن رودِ موسی کی جس طغیانی نے پورے حیدرآباد دکن کو بری طرح تہہ وبالا کیا وہ واقعۂ جاں کاہ یکم رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ بمطابق ۱۹۰۸ء روز دوشنبہ کو پیش آیا۔[۳۹] ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تصانیف ظفر علی خاں ادیب و شاعر[۴۰] اور مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار میں سہواً اس طغیانی کا سن ۱۹۰۵ء لکھا ہے۔[۴۱] یہ غلط فہمی انھیں کیوں ہوئی،اس کی تفصیل ظفر علی خاں کی نظم "شورِ محشر" کے جائزے کے دوران پیش کی جائے گی۔یہاں مقصد اس سانحے کے درست سن کا تعین ہے لہٰذا ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ واقعہ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء میں پیش آیا اور شہر حیدرآباد کو تباہ و برباد کر گیا۔[۴۲] بارش کا یہ سلسلہ طغیانی کے تین چار روز پہلے سے لگاتار جاری تھا۔نجم الغنی خاں نے سہواً لکھا کہ:

> ۲۶ ستمبر بمطابق ۲۹ شوال کو دوپہر سے ۲۸ ستمبر بمطابق یکم رمضان کی رات تک موسلا دھار پانی پڑا۔[۴۳]

یہاں شوال کے بجائے ۲۹ شعبان ہونا چاہیے کیونکہ وہ خود مانتے ہیں کہ یکم رمضان کی رات تک شدید بارش کے نتیجے میں دریائے موسی میں طغیانی ہوئی۔[۴۴] مانک راؤ وٹھل راؤ کا بھی یہی کہنا ہے کہ ۳۰ شعبان کو ۹ بجے سے ندی میں پانی بڑھنا شروع ہوا اور ۴ بجے شام تک دہلی دروازہ اور افضل گنج کے پل فیل پائیوں کے اوپر چڑھ گیا۔[۴۵] جن لوگوں کے مکانات دریا کے کنارے تھے ان لوگوں نے جلدی جلدی نقل مکانی شروع کی اور صبح سات بجے تک ہزاروں آدمیوں نے اپنے اپنے مکان خالی کر دیے۔[۴۶] طغیانی کے نتیجے میں ندی کے کنارے کا کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جو اِس سرے سے اُس سرے تک صاف نہ ہو گیا ہو اور کوئی خاندان ایسا نہیں تھا جس میں سے کم از کم دو چار آدمی نہ بہہ گئے ہوں۔[۴۷] صبح تک پانی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھا کہ افضل گنج اور چادر گھاٹ کے پلوں پر سے دو دو نیزے بلندی کے ساتھ بہنے لگا۔نتیجتاً اندرون و بیرون بلدہ کے بے شمار علاقوں میں پانی پھیل گیا۔طغیانی کے نتیجے میں متعدد مقامات کا بالکل صفایا ہو گیا۔[۴۸] یہ بارش حیدرآباد دکن والوں پر قہرِ خدا کی صورت میں برسی اور اس کے نتیجے میں جو بپتا پڑی ہے وہ ممکن نہیں کہ کوئی سنگ دل شقی القلب بھی اسے دیکھ کر اشکِ حسرت نہ بہائے۔[۴۹] مرزا فرحت اللہ بیگ اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

راستے میں لوگوں کی جو حالت اور پریشانی دیکھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی۔ سب کے سب نفسی نفسی کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ کوئی صندوق سر پر اٹھائے بھاگ رہا ہے۔ کوئی بچوں کو گود میں سنبھالے دوڑ رہا ہے۔[۵۰]

سید محمد فاروق نے اس صورتِ حال کی عکاسی درست طور پر اس شعر میں کی ہے:

اس مصیبت پر تری ہے سارا عالم رنج میں　　تیری حالت پر تاسف کر رہا ہے اک جہاں[۵۱]

نجم الغنی کا کہنا ہے کہ:

۳۶ گھنٹوں میں پندرہ انچ پانی برسا۔[۵۲]

جب کہ اس سے قبل مانک راؤ وٹھل راؤ کا بیان ہے کہ اس بارش میں جس سے یہ غیر معمولی طغیانی آئی تھی، مابین ایک رات اور دن کے ۱۷ انچ بارش ہوئی اور چالیس گھنٹوں میں جس قدر پانی بہا تھا اس کی مقدار تخمیناً سات کروڑ دو سو کسر فیٹ شمار کی گئی۔[۵۳] سید خورشید علی کے مطابق:

اس سال کی برسات حیدر آباد کی تاریخ میں ابدالآباد تک یادگار اور اس کی جگر فگار درد انگیز داستان صفحاتِ تاریخ پر قیامت تک خونیں حروف میں منقوش رہے گی۔[۵۴]

دو پشتوں سے دار الصدور نظام کو کبھی ایسی خرابی لاحق نہیں ہوئی تھی جیسی اس وقت ہوئی۔[۵۵] حقیقت بھی یہی ہے کہ حیدر آباد دکن کی تاریخ میں ایسی تباہی کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ امجد حیدر آبادی نے بارش کی شدت اور تباہی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں　　بارش کی لگاتار جھڑی، سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں　　وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی　　پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی[۵۶]

طغیانی کے دن بندگانِ خدا کو جن المناک دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوا ہے ان کے بیان کرنے سے زبان قاصر اور لکھنے سے قلم عاجز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ طغیانی کا دن قیامت کے دن سے کچھ کم نہ تھا۔ عجیب طرح کی بے بسی و بے چارگی کا عالم تھا۔ جدھر دیکھو... پانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہزاروں مکانات اور ہزاروں جانیں نذر سیلاب ہو گئیں۔[۵۷] محب حسین محب نے اس منظر کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے:

سنگ فصیل زور سے پانی کے بہہ گئے   پتھر بڑے بڑے کہیں گر گر کے رہ گئے[۵۸]

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۰۸ء کے وسط تک تو عالم یہ تھا کہ بارش کی قلت تھی لیکن ۱۸-۱۷ ستمبر سے یکا یک رت بدلی اور ۲۸ ستمبر تک ایسی جھڑی بندھی اور موسلا دھار بارش ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے نالے، کوئیں اور تالاب ابل پڑے۔ صرف بوسیدہ اور خستہ حال مکان ہی نہیں بلکہ اکثر پختہ عمارتیں بھی منہدم ہونے لگیں۔ جا بجا ریل کی پٹری بہہ گئی۔[۵۹] بقول عبدالحلیم شرر:

> یہ سب ہنگامہ اور یہ سارا شور محشر چند گھنٹوں میں ہو گیا۔ موسی ندی اپنا جلال و غضب دکھا کے چلی گئی۔ عالم پر خموشی اور موت کا سناٹا طاری ہے۔ نہ سڑکوں کا پتا ہے نہ گلیوں کا۔ نہ آبادی کا نشان ہے نہ عالی شان عمارتوں کا۔ جدھر نظر جاتی ہے پتھروں کا ڈھیر ہے اور حسرتوں کو انبار۔[۶۰]

مخلوق کے ضائع ہونے کے کئی سبب ہوئے۔ اکثر لوگ اس دھوکے میں رہے کہ پانی ان کے مکانات تک نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا تو مضبوط و مستحکم مکانات کا کچھ بگاڑ نہ پائے گا لیکن بمصداق اس مصرع کے "ماں درچہ خیالیم فلک درچہ خیال است" دفعتاً پانی کا ایسا ریلا آیا کہ لوگوں کو مع ان کے مکانات، بہا لے گیا۔ ہلاکتوں کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ رات کے وقت اپنے اپنے مکان میں پڑے سو رہے تھے کہ پانی نے ان کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور افسوس کہ ان بے چاروں کو اپنی جانیں بچا کر نکل جانے کا موقع تک نہ ملا۔[۶۱] ملبے کے نیچے سے ملنے والی اکثر نعشیں ان تاجروں اور ساہوکاروں کی تھیں جو اپنا مال و اسباب چھوڑ کر مکان سے جانے سے انکاری تھے۔[۶۲] اکثر آباد مقامات کے گنجان محلے مع اپنے بسنے والوں کے دریا برد ہو چکے تھے۔ ہزاروں جانیں تلف ہو چکی تھیں، اور لاکھوں کا اثاثہ ضائع ہو چکا تھا۔[۶۳] دوشنبہ کے دن صبح کے وقت جب کہ طغیانی اپنے انتہائی زور پر تھی، اس وقت لوگوں کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ لوگ مکان چھوڑ کر محفوظ مقام کی طرف بھاگے جاتے تھے لیکن انھیں کوئی جائے اماں نہیں مل رہی تھی۔ عفیفہ اور پاک دامن بی بیاں جنھوں نے اپنے مکان کی دہلیز تک کو نہ دیکھا تھا، سڑکوں پر نامحرم لوگوں کے سامنے بحالت پریشانی دوڑی پھرتی تھیں۔ اس وقت خاوند کو بیوی کی، ماں کو بچی کی، بہن کو بھائی کی اور اولاد کو والدین کی خیر و خبر کی مطلق فکر نہ تھی بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اکثر لوگ

بہ تحفظ جاں درختوں پر چڑھ گئے اور بہت سے پہاڑوں اور بلند مقامات پر جا کر بیٹھ گئے ۔[۶۴] ندی کے بیچ کا دھارا کناروں سے بیس پچیس فٹ بلند تھا۔ اس دھارے میں ہر قسم کا سامان، صندوق، پلنگ، تخت وغیرہ قلابازیاں کھا رہے تھے ۔[۶۵] ندی کے ایک جانب موجود لوگوں کو دوسری طرف کی خبر نہ ملتی تھی ۔ایسا منظر تھا کہ آج بھی اس کے خیال سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ندی کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

> اُس دھارے پر چکر کھاتی ہوئی لوہے کی سیکڑوں تجوریاں بہہ گئی اور کئی کئی میل دور جا کر نکلیں ۔[۶۶]

بقول سید خورشید علی:

> پانی کی خوف ناک لہریں ہر چیز کو نگلتی اور فنا کرتی چاروں طرف بڑھ رہی تھیں ۔ہزارہا آدمی عجب بے کسی اور بے بسی کے عالم میں نذرِ آب ہو رہے تھے ۔ظالم ندی نہ شکستہ حال بوڑھوں کی بے دست پائی کا لحاظ کرتی تھی اور نہ اس کو نوخیز نوجوانوں کی نوجوانی اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی ننھی ننھی جانوں کا پاس تھا ۔[۶۷]

افضل گنج اور چادر گھاٹ کے پل کے ٹوٹنے سے بہت زیادہ تباہی ہوئی ۔افضل گنج کے اسپتال سے سیلابی ریلا ٹکرایا تو اسپتال میں موجود بہت سے مریض بھی پانی میں بہہ گئے ۔[۶۸] مرزا فرحت اللہ بیگ اس تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> دارالشفا کے آس پاس کیا دیکھتے ہیں کہ سڑک پر ایک دریا بہہ رہا ہے اور اس میں کئی مُردے تیراکی کر رہے ہیں ۔[۶۹]

نعشوں کی یہ کیفیت تھی کہ جدھر دیکھو نعشیں نظر آتی تھیں ۔سُو وَں کی تعداد میں درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں اور ہزاروں کی تعداد میں غاروں اور ریت میں دبی ہوئی تھیں ۔[۷۰] نجم الغنی خاں کے مطابق:

> دیواروں پر آٹھ فٹ سے بھی زیادہ پانی کا نشان تھا ۔[۷۱]

جب کہ فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ:

> یہاں کے مکانوں پر پانی کا جو نشان تھا وہ کسی طرح انیس بیس فٹ سے کم اونچا نہ ہوگا ۔[۷۲]

ہزاروں آدمی کا ایسی حالت میں بچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔[73] جو لوگ بچ گئے تھے ان کا حال مُردوں سے بھی بدتر تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مصیبت زدہ عورتوں کے جگر خراش بین، ننھے ننھے معصوم بچوں کے دردناک نالہ وشیون اور تباہ حال مردوں کی دل گداز آہ و بکا سے آسمان پھٹا پڑتا تھا۔ ہر طرف ماتم بپا تھا اور محشر کا سماں دکھائی دیتا تھا۔[74]

سانحے کے بعد حکومت کی جانب سے فوراً امدادی سرگرمیاں شروع کی گئیں۔ لوگوں کو بچانے کے لیے اہل کار دوڑے چلے آئے۔ کشتیاں منگوائی گئیں اور لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے ہاتھیوں سے بھی مدد لی گئی۔[75] حکومت کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ نعشوں کی شناخت کیسے کی جائے۔ امتیازِ مذاہب اس وقت ایک دشوار مرحلہ تھا لہٰذا مجبوراً بلا امتیازِ مذہب وملت سب کو دفن کر دینا پڑا۔ ایسا جگر خراش منظر اس سے قبل حیدرآباد کے لوگوں نے کبھی آنکھوں سے دیکھا نہ سنا۔[76] ہر طرف ''سڑی ہوئی لاشوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے''۔[77] سید خورشید علی نے اس صورتِ حال کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ہزار ہا لاشوں کو جو قدم قدم پر پڑی ہوئی تھیں اور نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھیں، صفائی، کتوالی اور فوج والوں نے مل کر اٹھانا شروع کیا..... غسل وکفن، تجہیز و تکفین، فاتحہ یا کریا کرم کا تو کیا ذکر، اس بات کی تمیز بھی نہ ہو سکتی تھی کہ لاش مسلمان کی ہے یا ہندو کی..... ڈھیروں لاشیں بنڈیوں میں بھر کر شہر سے دور پہنچائی جا رہی تھیں کہ سب یکساں تہ خاک کر دی جائیں۔[78]

جب شہر سے پانی نکلنا شروع ہوا تو وہ جگر خراش مظالم جو اب تک چادرِ آب کے نیچے پوشیدہ تھے، نمایاں ہونے لگے۔ جہاں جہاں پانی کی خوف ناک لہریں پہنچیں تھیں۔ عام تباہی چھائی ہوئی تھی۔ جدھر نگاہ ڈالو ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا تھا۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ نصف سے زیادہ شہر کا پتا نہ تھا۔ یہ معلوم ہونا بھی مشکل ہو گیا کہ کون سا محلّہ کہاں آباد تھا۔ سڑکوں اور گلیوں کے آثار بھی مٹ چکے تھے۔[79] ایک طرف ہزاروں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے تو دوسری طرف لوگ فاقوں مر رہے تھے۔ مفلس اور مجبور لوگوں نے غلّے کی دکانوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔[80] موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بدمعاشوں اور لٹیروں کو لوٹ کھسوٹ کی سوجھی۔ بے حسی کی انتہا یہ تھی کہ مُردوں کے جسم سے زیورات اتارے گئے اور اگر کوئی چیز بوجہ جسم کے پھول جانے کے اتاری نہ جا سکی تو اس کو قطع کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔[81] خود غرضی کی انتہا یہ تھی کہ کوئی حضرت بغل میں بکرے دبا کر بھاگ رہے ہیں تو کوئی سونے چاندی لوٹنے میں مصروف۔[82] اگرچہ بڑی تعداد ایسے لوگوں

کی تھی جواس انسانی المیے پر خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر امدادی کاموں میں مصروف تھے ۔ان لٹیروں نے پوری انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔ نظام حیدرآباد کی جانب سے فوری طور پر ریلیف کمیٹیاں بنائی گئیں،لنگر خانے کھولے گئے ۔عارضی رہائش کا انتظام کیا گیا۔کپڑے ، بستر اور بنیادی ضروریات کی اشیا کی فراہمی ممکن بنائی گئی۔[۸۳] مفلوک الحال اور بے خانماں لوگوں کی امداد کے لیے شہر کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے مختلف عہدے داروں کو ذمے داری سونپی گئی۔[۸۴] اس زمانے میں حیدرآباد دکن میں غیر ملکیوں کے ستارے عروج پر تھے لہٰذا عزیز مرزا بھی اُسی زمانے میں محکمۂ داخلہ کے معتمد بنائے گئے۔[۸۵] مہاراجا کشن پرشاد کی قائم کردہ ریلیف کمیٹی کے معتمد بھی عزیز مرزا ہی مقرر ہوئے ۔[۸۶] اُن کے علاوہ دوسرے محکمے سے عہدے داروں کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا ۔ان میں ایک اور اہم نام مولانا ظفر علی خاں کا ہے۔[۸۷] نواب وقار الملک کے مطابق:

> عزیز مرزا صاحب نے انسانی ہمدردی اور نیز خدا ترسی کے خیال سے اس موقعے پر غیر معمولی محنت کی۔ ڈھیروں منہدم کھنڈروں اور افتادہ مکانوں میں جہاں راستہ بھی نہ تھا، شب و روز مارے مارے پھرتے اور روا جب الرحم تتم رسیدوں کا پتا لگاتے تھے...تیرہ لاکھ رقم چندہ جمع کی اور اس کی تقسیم کا انتظام کیا۔[۸۸]

اس سلسلے میں انھوں نے ناچار اور غریب لوگوں کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کیا۔نعشوں کے منتقل کرنے اور بڑے بڑے ملبے سے ان نعشوں کو نکالنے کا معقول انتظام کیا۔انجینئروں کی زیرِ نگرانی پلوں اور دوسری عمارتوں کی دیکھ بھال اور مرمت کروائی ۔رات رات بھر اصلاحی کام میں مصروف رہتے اور روزانہ اس کی روداد لکھ کر ٹائپ کرواتے اور پھر سررشتہ کے ناظم کے پاس بھجواتے ۔انھی کی تحریک پر تمام سرکاری ملازمین کو ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کی گئی۔[۸۹] مولوی محمد یحییٰ تنہا کے مطابق:

> سیلاب حیدرآباد کے زمانے میں آپ نے عوام کے لیے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں کہ بیمار ہو گئے۔[۹۰]

لیکن صحت بگڑنے کے باوجود وہ فرائض کی بجا آوری سے باز نہ آئے ۔[۹۱] اس بے لوث محنت کی وجہ سے پورے حیدرآباد میں ان کی بڑی نیک نامی ہوئی تھی لیکن ان کے حاسدوں نے اس موقعے پر ان کے سب سے بڑے مخالف مسٹر واکر (Sir George Casson Walker) جو ۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء ریاست حیدرآباد دکن

میں مالی امور کے مشیر تھے، کو استعمال کر کے عزیز مرزا پر اپنے پسندیدہ اور خوش حال افراد کو نوازنے کا الزام لگایا۔[۹۲] جب کہ مولوی عزیز مرزا نے چندے سے حاصل شدہ رقم کی تقسیم کا انتظام ایسی عمدگی سے کیا تھا کہ حسابات میں ایک پائی کا بھی فرق نہ آیا۔[۹۳] کمیٹی کے ذریعے تحقیقات کروائی گئیں تو سارے الزامات غلط ثابت ہوئے۔ اس پر عزیز مرزا کی عزت میں مزید اضافہ ہوا۔ نظام نے خوش ہو کر میر عثمان علی خاں کو رموزِ مملکت اور انتظامِ حکومت سکھانے کی ذمہ داری بھی انھی کے سپرد کی۔ یہ بات مسٹر واکر کو سخت ناگوار گذری۔[۹۴] لیکن مسٹر واکر کی مخالفت کے باوجود عزیز مرزا کو اس سیلاب کے دوران عمدہ انتظامی امور کی انجام دہی کے صلے میں سرکارِ برطانیہ کی طرف سے اول درجے کا ''تمغۂ قیصرِ ہند'' عطا ہوا۔[۹۵] یہ تمغہ طغیانی رودِ موسیٰ کے فوراً بعد ۱۹۰۸ء ہی کو ملا۔[۹۶] دلچسپ بات یہ ہے کہ وہی مسٹر واکر جو مولوی عزیز مرزا کے سب سے بڑے مخالف تھے، تمغہ ملنے کے بعد اپنے مبارک باد کی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ:

> یہ آپ کی محنتوں کا ادنیٰ صلہ ہے۔[۹۷]

''قیصرِ ہند'' کے یہ تمغے دو قسم کے تھے۔ ایک چھوٹا تمغہ تھا جو ڈنر سوٹ پر لگانے کے لیے تھا اور دوسرا بڑا تمغہ جو درباری لباس پر لگانے کے لیے تھا۔ دونوں تمغے سونے کے تھے جس پر انگریزی میں "KAISAR-HIND" FOR PUBLIC SERVICE IN INDIA درج تھا۔[۹۸]

دوسرے بہت سے لوگوں کی جانب سے بھی انسانی ہمدردی کی لازوال داستانیں دیکھنے کو ملیں۔ لیڈی اسسٹنٹ سرجنوں اور نرسوں نے ایسی بہادری دکھائی کہ ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ۲۷ ستمبر کے ہولناک طوفان کے نتیجے میں جب سیلاب کا پانی افضل گنج کے پل کو توڑتا ہوا اسپتال میں داخل ہوا اور متعلقہ حکام نے تمام سرجنوں اور نرسوں کو محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی ہدایت کی تو وہ مریضوں کو چھوڑ کر جانے پر تیار نہ ہوئے۔[۹۹] بلکہ آخری دم تک خدمت میں مصروفِ کار رہے۔ فوج نے بھی اس زمانے میں جو کام کیا اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو انھوں نے شہر میں امن قائم کیا۔ اس کے بعد دبے ہوئے لوگوں کو ملبے سے نکالنے، مُردوں کو دفن کرنے اور حیدر آباد کو وبائی امراض سے بچانے کے اقدامات کیے۔[۱۰۰] اس کے علاوہ ریلیف کے کاموں میں خواتین کا کردار بھی قابلِ ذکر رہا۔ رسم و رواج کی پابند وہ خواتین جو گھروں سے باہر بھی نکل نہیں پا رہی تھیں، ان کے لیے یہ خواتین فرشتہ ثابت ہوئیں۔ ان میں مسز حیدری اور مسز نائڈو کے علاوہ یورپین خواتین

مسز سہراب جی، مسز اسٹیونس، مسز جیفری، مسز بلین، مسز فیلوز، مسز لاریمر، مسز چیٹ وڈ وغیرہ نے بھی امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ ریلیف کمیٹی کی سیکریٹری مسز حیدری اور جوائنٹ سیکریٹری مسز نائڈو مقرر ہوئیں۔ مسز واکر کو کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ مسز نائڈو کے مکان میں کمیٹی کا دفتر قائم ہوا۔ تمام خواتین نے بڑی مستعدی اور جفاکشی سے دور دراز آباد پردہ نشیں خواتین تک کپڑے اور غذائی اجناس کی فراہمی کو ممکن بنایا۔ امدادی سرگرمیوں میں مسز سید ہمایوں مرزا، بنت نصیر الدین حیدر صاحبہ اور عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی صاحبزادی مسز خدیو جنگ وغیرہ نے بھی حصہ لیا۔[۱۰۱]

سرکاری رپورٹ کے مطابق اس سانحے میں اندازاً دو ہزار لوگ لقمۂ اجل بنے۔[۱۰۲] لیکن جس قسم کی تباہی ہوئی اس کو دیکھ کر ان اعداد و شمار پر یقین کرنا محال ہے۔ کیونکہ "موسیٰ ندی کے اطراف کی آبادی کے تین ہزار افراد تو دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گئے" تھے۔[۱۰۳] خود اخبار ایڈووکیٹ بمبئی اور ٹائمز آف انڈیا نے ہلاک شدگان کی تعداد پانچ ہزار سے زائد بتائی ہے۔[۱۰۴] بعض انگریزی اخبارات نے یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک بتائی۔[۱۰۵] اموات اور ہلاکتوں کا اندازہ عبدالحلیم شرر کے اس مضمون سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے جس میں طغیانی رود موسیٰ کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

> موسیٰ ندی ایک بھوکے اژدھے کی طرح پیچھے دوڑی آتی ہے ... ہزاروں بندگانِ خدا کو نگل گئی اور پیٹ نہیں بھرتا ... ان جگہوں کی خونی تصویر دیکھی بھی نہیں جا سکتی جہاں تو نے اپنا جوش دکھانے سے پہلے ہی لوگوں کو اپنی آغوشِ مرگ میں گھیر لیا ہے۔ وہاں کا عالم! عالمِ مرگ! عالمِ تباہی! عالمِ بے کسی و بے بسی نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے ... کوئی تو تیرے دستِ ستم سے بچا ہوتا۔[۱۰۶]

یہ بات تو پوری طرح عیاں ہے کہ بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طغیانی نے آبادی کی آبادی نیست و نابود کر دی۔ اس کے باوجود ماہرین نے ہلاک شدگان کی تعداد پر شبہات کا اظہار کیا ہے۔ نجم الغنی خاں کے مطابق اس سانحے میں پچاس ہزار سے کم جانیں ضائع نہیں ہوئیں اور تقریباً پندرہ سے بیس ہزار مکانات گر کر تباہ ہو گئے۔[۱۰۷] سانحے کے فوراً بعد دکن سے نکلنے والے رسالے ادیب کے طوفان نمبر کے مطابق اس طغیانی میں پچاس ہزار سے کم جانیں تلف نہیں ہوئیں۔[۱۰۸] اکثر ماہرین اسی تعداد کو درست مانتے ہیں۔ ہلاکتیں اور تباہی اس قدر زیادہ تھی کہ پورے حیدرآباد دکن میں افراتفری پھیل گئی۔ معاملے کی سنگینی

کااندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد دکن کی اس تباہی کا حال بہت تیزی سے اطرافِ عالم میں پھیل گیا۔ کلکتہ، مدراس، بمبئی، علی گڑھ، لکھنؤ کے علاوہ لندن وغیرہ میں بھی حیدرآباد دکن کے متاثرین کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے غرض سے جلسے منعقد کیے گئے۔ مصیبت زدگان کے لیے لاکھوں روپے چندے کی مد میں جمع ہوئے۔ صرف چند روز میں بمبئی کے لوگوں نے ایک لاکھ روپے فراہم کیے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے خطوط کا سلسلہ شروع ہوا۔ قیصر ہند نے وائسرائے بہادر کو اس ہولناک تباہی کے حوالے سے خط لکھ کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ شہزادہ ویلز اور گورنر بمبئی نے نظام حیدرآباد کو ہمدردی کے پیغامات بھیجے۔ ندوۃ العلماء اور مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی جانب سے بھی ہمدردی کے پیغامات موصول ہوئے۔ پورے ہندوستان میں جگہ جگہ اس مناسبت سے جلسے ہوئے یہاں تک کہ ان مصیبت زدگان کے لیے لندن میں بھی ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں نواب عماد الملک، مولوی سید حسین بلگرامی، مسٹر کے جی گپتا، مسٹر آر جے ٹاٹا، سید علی بلگرامی، مسٹر رومیش چندادت، مسٹر گوکھلے اور مسٹر علی اکبر کے علاوہ ہندوستان کے سابق وائسرایان لارڈ لنسڈون، لارڈ رپن، گورنر لارڈ ایمپتھل، لارڈ ہیمنگٹن، لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس لاٹوش اور سر چارلس ایلیٹ وغیرہ بھی شریک تھے۔ یہ اجلاس ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو انجینئرس ہال میں بصدارت لارڈ میئر کے منعقد ہوا اور تقریباً دس ہزار کے قریب چندہ جمع ہوا۔ شہزادہ ویلز نے بھی اس میں سو پاؤنڈ عنایت کیے۔[۱۰۹]

طغیانی رودِ موسیٰ ایک صدی سے زائد کا عرصہ گذر گیا لیکن آج بھی اس کی ہولناکی کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سید خورشید علی نے درست لکھا ہے کہ:

> کیا زمانے کا الٹ پھیر ہے کہ صدہا سال کی متواتر اور مسلسل کوششوں میں حیدرآباد کو ... جو شان و شوکت نصیب ہوئی تھی، چشم زدن میں سب پر پانی پھر گیا ... جہاں ہر وقت عجیب چہل پہل رہتی تھی آج ایک وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا ہے اور وہ عالی شان سربفلک عمارتیں جو سیکڑوں تمناؤں اور ہزاروں ارمانوں کے ساتھ بے شمار دولت صرف کرنے پر تعمیر ہوئی تھیں۔ آج مسمار و نابود ہو کر زمین کے برابر ہوگئی ہیں۔[۱۱۰]

اس صورتِ حال میں جو لکھ پتی تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی ہی دیر میں فقیر سے بھی بدتر ہوگئے۔[۱۱۱] غرض کہ یہ ندی ''آناً فاناً میں عصائے موسیٰ سے وہ عظیم آلشان [کذا: عالی شان] اژدھا بن گئی جو دم بھر میں مصر کی ہزارہا خلقت کو نگل گیا تھا''۔[۱۱۲] افسوس ناک صورتِ حال یہ تھی کہ ان ہزارہا نعشوں میں سے بے

شمار نعشیں ان کے پیاروں کو مل بھی نہ سکیں۔ ندی کے اس عمل پر شکوہ کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر نے بڑے جذباتی انداز سے لکھا کہ:

> موسیٰ ندی! بتا کہ ہمارے مُردوں کو بہا کے تو کہاں لے گئی؟ ایک دن ضرور آنے والا ہے... جب تجھے اپنے اس ظلم وستم کا یقیناً جواب دہ ہونا پڑے گا... آہ تیرا غیض وغضب! تیرا جوش وخروش!... تو کیا تھی اور دم بھر میں کیا ہو گئی۔[۱۱۳]

مندرجہ بالا صفحات میں طغیانیِ موسیٰ ندی کی تباہی وبربادی کی جو تصویر پیش کی گئی وہ کسی طرح قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے واقعے پر ہمارے شعرا اور ادیب خاموش رہے ہوں۔ بہت سے شعرا نے اس سانحے کو موضوعِ سخن بنایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور اہم نام مولانا ظفر علی خاں کا ہے۔

جس زمانے میں یہ سانحہ ہوا مولانا ظفر علی خاں بسلسلۂ ملازمت دکن میں ہی مقیم تھے۔ طغیانی نے جب پوری ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لیے تحریک چل نکلی تو مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس موضوع پر ایک طویل نظم لکھی۔ اس نظم سے ادبی وشعری حلقوں میں ان کا نام معروف ہو گیا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اس نظم کو اوّلیت کا درجہ ملا۔[۱۱۴] راقم نے مندرجہ بالا صفحات میں اس سانحے کے درست سن کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی غلط فہمی کا ذکر کیا ہے۔ دراصل یہ غلط فہمی انھیں ظفر علی خاں کی مشہور نظم ''شورِ محشر'' کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پہلی بار یہ غلطی ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔[۱۱۵] جب اس نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نظم ''حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں رودِ موسیٰ کی طغیانی (۱۹۰۵ء) کے موقعے پر لکھی گئی اور ہزاروں کی تعداد میں چھپی''۔[۱۱۶] جب کہ دوسری بار انھوں نے ۱۹۹۳ء[۱۱۷] میں شائع ہونے والی ایک اور تصنیف میں اپنی اس غلطی کو دہراتے ہوئے لکھا کہ ''۱۹۰۵ء میں رودِ موسیٰ کی طغیانی ایک حادثۂ عظیم تھی جس نے حیدرآباد میں حشر برپا کر دیا تھا''۔[۱۱۸] اس سے قبل تفصیل سے وضاحت ہو چکی ہے کہ طغیانی رودِ موسیٰ کا سانحہ ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا اور ظفر علی خاں نے اپنی مشہور نظم ''شورِ محشر'' ظاہری بات ہے اس سانحے کے رونما ہونے کے بعد ہی کہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس بارے میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''رودِ موسیٰ'' کی طغیانی پر انھوں (ظفر علی خاں) نے جو نظم ''شورِ محشر'' کے نام سے لکھی اسے پڑھ کر مولانا حالی نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ میں[۱۱۹] بہت تعریف کی ہے۔ راقم نے مولانا حالی کا مذکورہ خط غور سے دیکھا تو

اندازہ ہوا کہ اس خط میں مولانا نے کہیں بھی نظم ''شورِ محشر'' کی تعریف نہیں کی اور نہ ہی پورے خط میں اس نظم کا کہیں ذکر کیا ہے۔ظاہری بات ہے جو نظم حالی کے تحریر کردہ اس خط کے تین برس بعد یعنی ۱۹۰۸ء کی تخلیق ہو، اس کی تعریف وہ ۱۹۰۵ء میں کیسے کر سکتے تھے؟ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مذکورہ خط کا حوالہ مکاتیب حالی مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی سے دیا تھا۔انھوں نے یہ خط کہاں سے لیا، اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔راقم نے اس خط کی تلاش شروع کی تاکہ تاریخ کے حوالے سے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشے کو دور کیا جا سکے۔ بالآخر یہ خط دکن ریویو مارچ ۱۹۰۵ء کے شمارے میں مل ہی گیا۔اس خط کی آمد پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے لکھا کہ ''حقیقت یہ ہے کہ بی اے کی ڈگری نے بھی مسرت وفخر کی وہ کیفیت ہمارے دل میں پیدا نہ کی تھی جو اس والا نامہ کی ہے''۔[۱۴۰] اس نظم کی مزید وضاحت سے قبل مولانا حالی کے مذکورہ خط کے متن کو ملاحظہ کیجیے:

> جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا... سرے ہی پر آپ کی نظم جو''رودِ موسی'' پر لکھی گئی تھی، نظر پڑی اوّل سے آخر تک بڑے غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی... اب پرانی نظمیں تو (الا ماشاءاللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے، کہیں نظر نہیں آتی۔لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا... رودِ موسی پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے... اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتا۔[۱۴۱]

پورے خط میں مولانا حالی نے کہیں بھی نظم ''شورِ محشر'' کا ذکر نہیں کیا البتہ ''رودِ موسی'' پر لکھی گئی نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کی نیچرل شاعری کی داد دی ہے۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی ایک اور تصنیف میں ''شورِ محشر'' کے ضمن میں لکھا کہ ''مختلف ادبی جریدوں نے اس نظم کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔دکن ریویو کے شمارہ جنوری ۱۹۰۵ء میں بھی یہ نظم چھپی''۔[۱۴۲] جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ شمارے میں جو نظم چھپی وہ ''شورِ محشر'' نہیں بلکہ ''رودِ موسی'' ہے۔[۱۴۳] ۱۳۲ اشعار پر مشتمل اس نظم میں شاعر نے طغیانی

سے ہونے والی تباہی کا نہیں بلکہ اس ندی کے حسن وجمال اور خوبصورتی کا حال بیان کیا ہے۔ یہ نظم نیچرل شاعری کے سلسلے کی ایک نا قابلِ فراموش کڑی تھی۔ اس لیے مولانا حالی نے خط لکھ کر اس نظم کی تعریف کی تھی۔ نظم میں ظفر علی خاں نے جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ مناظرِ قدرت کی جس انداز سے تصویر کشی کی ہے وہ بڑی مؤثر ہے۔ نظم کا ڈرامائی انداز قاری کے ذہن کو ایسی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں سے اسے مختلف مناظر کی چلتی پھرتی تصویریں نگاہوں کے سامنے دکھائی دیتی ہیں۔[۱۲۴] شاعر کبھی نہر کے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے کہ:

اے نہر تیرا پانی شیریں ہے یا گوارا　　مصری کی اک ڈلی ہے جو تیری کنکری ہے[۱۲۵]

اور کبھی ندی کے آس پاس موجود ہریالی اور مختلف موسموں میں ندی کے اندر آنے والی تبدیلی کا حال یوں بیان کیا ہے:

موجوں کے آستاں پہ سبزے کا لہلہانا　　آبِ رواں کا آنچل جھالر ہری ہری ہے
جنگل میں ہو رہا ہے تیرے قدم سے منگل　　تو صنع[۱۲۶] ایزدی ہے تو شانِ داوری ہے[۱۲۷]

غرض کہ دکن ریویو ۱۹۰۵ء میں شائع ہونے والی اس نظم میں کہیں بھی اس طغیانی کا حال بیان نہیں کیا گیا جس نے حیدر آباد دکن کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کیونکہ نظم کا موضوع ''رودِ موسیٰ'' ہے اس لیے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو گمان ہوا ہوگا کہ یہ ہولناک سانحہ ۱۹۰۵ء میں رونما ہوا۔ لہٰذا اپنی دو مختلف تصانیف میں نہ صرف انھوں نے اس سن کو دہرایا بلکہ مولانا حالی کے خط کا حوالہ بھی دے ڈالا جو انھوں نے نیچرل شاعری کی تعریف کے ضمن میں ظفر علی خاں کو لکھا تھا۔ کسی حادثے، سانحے یا واقعے کی تاریخ کے بیان میں ضروری ہے کہ ہم مستند تاریخ کی کتابوں سے ضرور مدد لیں۔ اگر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار حیدر آباد دکن پر لکھی گئی مستند تاریخوں کا مطالعہ کرتے تو ان سے یہ سہو ہرگز نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کا یہ کہنا کہ اب یہ نظم ''نایاب ہے اور ان کے کسی مجموعۂ کلام میں بھی شامل نہیں''[۱۲۸] سراسر غلط ہے۔ کیونکہ یہ نظم نامکمل حالت میں ''شورِ محشر'' ہی کے نام ان کے شعری مجموعے بہارستان میں شامل ہے۔[۱۲۹] اس مجموعے میں نظم کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں بند شامل ہے جب کہ پہلا، دوسرا اور چھٹا بند اس مجموعے میں موجود نہیں۔[۱۳۰] دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نظم کا تعارف کراتے ہوئے بہارستان کے مرتب اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے بھی طغیانی رودِ موسیٰ کے سانحے کا سن ۱۹۰۸ء ہی درج

کیا ہے۔[۱۳۱]

طغیانی رودِ موسی کے بعد خانماں برباد لوگوں کے لیے شہر میں جب مختلف امدادی مراکز قائم کیے گئے تو افضل گنج کے علاقے کا انتظام، جہاں تقریباً پچاس ہزار تباہ حال انسانوں کے کھانے پینے، کپڑے اور رہائش کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ ظفر علی خاں کے سپرد ہوا[۱۳۲] اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے سہواً اس علاقے کا نام افسر گنج لکھا ہے۔[۱۳۳] "افضل گنج" میں فرض کی ادائی کے دوران ظفر علی خاں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے معیبت زدوں کی مدد کی۔ سیلاب کی زد میں آیا ہوا ایک مکان جو گرنے والا تھا، اس مکان میں ایک عورت اور کم سن بچہ پھنسے ہوئے تھے۔ امداد کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں ظفر علی خاں تمام خطرات سے بے پروا ہو کر اس مکان میں پہنچ گئے اور عورت اور بچے کو صحیح سالم نکال لائے۔ ان کے نکلنے کے چند منٹ کے بعد ہی وہ مکان زمین بوس ہو گیا۔[۱۳۴] انھوں نے نہایت ہمدردی اور جاں سوزی سے مسلسل اٹھارہ دن تک، دن رات یہ خدمت انجام دی۔ حکومت نظام نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خوشنودی کا اظہار کیا۔[۱۳۵] اس قیامت خیز طغیانی کے بارے میں ظفر علی خاں کی نظم "شورِ محشر" کو ہزاروں کی تعداد میں چھاپا گیا۔[۱۳۶] اور اس کی آمدنی رودِ موسی کے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے وقف کر دی گئی۔ انھوں نے یہ نظم ایک بڑے جلسے میں بھی سنائی جس میں مہاراجہ سر کشن پرشاد کے علاوہ بہت سے دوسرے حیدرآبادی امرا اور اکابر سمیت مسٹر وا کر بھی موجود تھے۔[۱۳۷] ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اس نظم کا بڑا شہرہ رہا۔[۱۳۸] نظم کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ کان پور سے نکلنے والے ادبی رسالے زمانہ نے بھی اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔[۱۳۹] اور یہیں سے نقل کر کے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تصنیف ظفر علی خاں ادیب و شاعر کے ضمیمے میں شامل کیا۔[۱۴۰] لیکن اب بھی اس بات کا امکان ہے کہ اس نظم کے کچھ بند آج بھی نایاب ہیں۔ شک میں مبتلا کرنے کا باعث مدیر مخزن سر عبدالقادر کا وہ جملہ ہے جو انھوں نے اس نظم کے تعارف میں لکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ "نظم مستقل قدر کے قابل ہے اس لیے اس کے پہلے چھے بند ہم ان اوراق میں شائع کرتے ہیں"۔[۱۴۱] لہٰذا وہی چھے بند آج تک دستیاب ہو سکے۔ نظم کے بقیہ حصے سے آج بھی اردو دنیا محروم ہے۔ نظم کی تمہید میں ظفر علی خاں نے حیدرآباد دکن کی بربادی کے بعد وہاں کے باسیوں کی پریشانی اور غم والم کی کیفیات کا اظہار درج ذیل اشعار میں کیا ہے:

اس باغ میں ہے کیسا یہ مجمع پریشاں — صورت سے فکر ظاہر چہروں سے غم نمایاں
لالہ کی طرح سب کے سینوں میں داغ تاباں — شبنم کی طرح سب کی آنکھوں سے اشک غلطاں
ماتم بھی ایک دو کا گر ہو تو صبر کر لیں — لیکن یہاں تو صدہا گھر ہوگئے ہیں ویراں
قہر خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر — بن کر قضائے مبرم موسیٰ ندی کا طوفاں[142]

یہ وہی ندی ہے جس پر حیدر آباد کے لوگ دل وجان سے فدا تھے اور جس کے نغمے ہمیشہ سے گائے جاتے تھے۔ جس کے حسن میں کھو کر اور خوش گوار فضاؤں کو یاد کر کے شعرا اور ادبا، اسے موضوعِ سخن بناتے تھے۔ بقول ظفر علی خاں:

سمجھے ہوئے تھے جس کو ہم شہر کی رگِ جاں — میں جس کے وصف میں تھا کل اس طرح غزل خواں[143]

اس شعر کے بعد تمہیدی بند کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے بند کا آغاز۔ اس بند میں ندی کے حسن اور خوبصورتی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس بند کے اکثر اشعار وہی ہیں جو اس سے قبل ''رودِ موسیٰ'' کے نام سے دکــن ریــویــو کی زینت بن چکے تھے۔[144] البتہ اس نظم کے سات اشعار ''شورِ محشر'' میں شامل نہیں۔[145] ''شورِ محشر'' کے دوسرے بند کے آخری دو اشعار نئے ہیں اور ''رودِ موسیٰ'' میں شامل نہیں۔ ان ہی دو اشعار کے ذریعے شاعر دوسرے بند میں اپنی کہی ہوئی ہر بات کی نفی کرتا ہوا نظم کے اصل موضوع کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

آصف کہ جس کے سر پر سایہ ہے کبریا کا — جس کی جبیں سے ظاہر شانِ سکندری ہے
جو کچھ کہا ہے میں نے اے نہر تیری نسبت — الزام شاعری ہے افسوس میری نسبت[146]

دوسرے بند میں دل فریب مناظر کو پیش کرنے اور رودِ موسیٰ کی تعریف میں کیے گئے تمام اشعار کو الزام شاعری قرار دینے کے بعد تیسرے بند میں شاعر ''امڈی ہوئی ندی کے طوفان درماں کا خوف ناک منظر پیش کرتا ہے''۔[147] یہاں اس کا نرم اور شیریں لہجہ اچانک تند و تیز اور تلخ ہو جاتا ہے:

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا — الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا
تیری ہر ایک ٹکر داعی بنی اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا
اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا — کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا[148]

مسلسل بارش اور اس کے نتیجے میں آنے والے طوفان نے جب تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع کیا تو انسان کی ساری کوششیں اور تدبیریں، اس طوفان کو روکنے میں نا کام ثابت ہوئیں اور پورے حیدرآباد دکن میں ایک ایسے انسانی المیے نے جنم لیا جس میں ہر انسان حسرت و یاس کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ دکن کی تاریخ میں انسانی بے بسی اور بے چارگی کی ایسی دوسری مثال کم ہی ملے گی۔ چوتھے بند میں شاعر نے اس صورتِ حال کو اس شعر میں نظم کیا ہے:

قدرت کی طاقتوں کو دستِ قضا ہی روکے　　　انساں کی کوششیں ہیں بے کار اور معطل[۱۴۹]

اس منظر کو دیکھنے والے بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اس زمانے کا حیدرآباد ایک ایسے کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جیسے روزِ محشر کسی نے صور پھونک کر اسے نیست و نابود کر دیا ہو۔ اس کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کا بیان ہے کہ:

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کو بکو ہے　　　شور نشور برپا بلدے میں سو بسو ہے[۱۵۰]

تباہی و بربادی بھی ایسی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ندی کا پانی ہر لحظہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا شہر صفحۂ ہستی سے مٹ کر دریا کا حصہ بن جائے گا۔ بڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ کر لوگوں کا خوف کے مارے جو حال تھا اس منظر کو شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے:

جوش و خروش اس کا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے　　　سہمی ہوئی ہے خلقت ہوش و حواس[۱۵۱] ہیں شل[۱۵۲]

جیسے جیسے مکانات کھنڈر میں تبدیل ہوتے گئے اور انسانی نعش جا بجا پانی میں بہتی دکھائی دیں تو شاعر اس منظر کو کربلا کے مناظر سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور رہا کہ:

ہر ہر کھنڈر میں لاشے صدہا پڑے ہوئے ہیں[۱۵۳]　　　بلدہ کا ہر محلّہ ہے کربلا کا مقتل[۱۵۴]

حسرت و غم کی تصویر پیش کرتے ہوئے اس تباہی کا ایسا حال نظم کے پانچویں بند میں نظر آتا ہے کہ آج بھی اس طوفان کے ہولناک مناظر انسان کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان اشعار میں شدتِ غم اور انسانی جذبات و احساسات کی حقیقی مصوری نظر آتی ہے جیسے:

وا حسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا　　　ہر نخل آرزو کا بنیاد سے اکھڑنا
دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا　　　نگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا

اس ہاتھ کا، نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی   بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا
شان جلال باری قہر خدا کا نقشہ   ہر لہر کا بپھرنا ہر موج کا اکڑنا[۱۵۵]

افسوس ناک حقیقت یہی ہے کہ اس طوفان کے نتیجے میں تقریباً ہر گھر سے جنازے اٹھے اور ہر وہ شخص، جو بچ گیا اس کے پاس اپنی اپنی ایک الگ دردناک کہانی ہے جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان خونی داستانوں کو الفاظ میں بیان کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ غم واندوہ کی اس داستان پر درد کو قلم بند کرنے اور سنانے میں شاعر کا کتنا جگر خون ہوا ہوگا[۱۵۶] اس کا اندازہ ہم اس نظم کے آخری بند کے مطالعے سے کر سکتے ہیں:

پھر بھی نہیں ہے لیکن یہ غم وہ غم کہ جس کا   حق ہو ادا زباں سے یا چشم خوں فشاں سے
صدہا ہزارہا گھر ڈوبا ہوا ہے غم میں   کیا خاک ان کی تسکیں ہو ایک نوحہ خواں سے
ایسی مصیبتوں کا جن سے فلک بھی کانپے   کیوں کر مقابلہ ہو اک مشت استخواں سے[۱۵۷]

یہ نظم ظفر علی خاں نے اس طغیانی کے متاثرین کے لیے لکھی تھی لہٰذا جس جلسے میں یہ نظم سنائی گئی اس کے سامنے پورا منظرنامہ پیش کرنے اور اس تباہی کی تصویر دکھانے کے لیے نظم میں سوز وگداز پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے:

ندی کے دونوں جانب ہے ایک ہو کا عالم   حیراں ہے عقل آئے اتنے کھنڈر کہاں سے
بازار اجڑ گئے ہیں ویران ہیں دکانیں   سنسان ہیں محلے رستے ہیں بے نشاں سے
پامال ہو گئی ہے بستی یہ آفتوں کی   تاراج ہو گیا ہے یہ گلستاں خزاں سے[۱۵۸]

تمام مصیبتوں اور پریشانی کے باوجود شاعر اس گلشن کو پھر سے آباد کرنے کا عزم وحوصلہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں[۱۵۹] نے ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی، اس اعتراف کا مشاہدہ ان اشعار میں کیا جا سکتا ہے:

لاکھوں ستم رسیدہ جو فاقہ کر رہے تھے   اٹھے ہیں سیر ہو کر اس کے کرم کے خواں سے
احسان مانتے ہیں اپنے نظام کا ہم   منت پذیر دل کی زینت ہے امتناں سے[۱۶۰]

اور آخر میں صاحب حیثیت لوگوں کو دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل اور مصیبت زدگان کے لیے مدد کی درخواست بھی کی ہے:

جیبوں کو اپنے ہم بھی پیسوں سے کر دیں خالی   نکلے ہیں لعل و گوہر جس طرح بحر و کاں سے

مدراس و بمبئی سے جب آرہے ہیں لاکھوں   لازم یہ ہے کروڑوں کا چندہ ہو یہاں سے[۱۶۱]

اس نظم کا اثر بہت گہرا ہوا۔ بہت عرصے تک ادبی حلقوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ ندی کی تندی وتیزی کا قیامت خیز منظر اور بپھری ہوئی لہروں کے نتیجے میں آنے والی تباہی وبربادی کی جیسی تصویر ظفر علی خاں کی اس نظم میں پیش کی گئی ہے، بہت کم نظمیں واقعات کو اس طرح پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

طغیانی رودِموسی کے موضوع پر لکھنے والے دوسرے اہم شاعر سید احمد حسین امجد حیدرآبادی ہیں۔ امجد نے ابتدائی پانچ چھے برس تک زیادہ تر غزلیں اور رباعیاں کہیں لیکن اس زمانے کا بیش تر کلام ۱۹۰۸ء کی طغیانی رودِموسی کی نذر ہوگیا۔[۱۶۲] اس واقعے نے ان کی شاعری میں عجیب طرح کا سوز وگداز پیدا کیا۔ ان کو شاعری کا چسکا تو ناسخ کے دیوان کے مطالعے سے ہوا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں انھوں نے پہلا شعر جو موزوں کیا۔[۱۶۳]

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا   مگر یا رب نہ ہوتا مہرباں وہ مہرباں اپنا[۱۶۴]

اس شعر میں بھی ان کے لہجے کا سوز وگداز پوری طرح نمایاں ہے۔ امجد حیدرآبادی طغیانی رودِموسی سے راہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ اس سانحے کے نتیجے میں ان کی والدہ، بیوی اور بیٹی، ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھیں۔[۱۶۵] وہ خود اس حادثۂ جاں کاہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> رات کے آٹھ بجے تک ہمارے گھر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی چڑھ آیا... ہمارے لیے یہ بہت نازک وقت تھا... نہ اِدھر کوئی راستہ نہ اُدھر کوئی سفر، اِدھر موت اُدھر ملک الموت... فوراً ماں کا ہاتھ پکڑا اٹھ کھڑے ہوئے، ماں کے ساتھ بیوی، بیوی کی گود میں بچی،... میر قافلہ نے پہلے قدم رکھا اور یہ سمجھ کر کہ پانی میں اتر رہے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہمارا قدم ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر پڑا۔ ہمارے بعد والدہ اور بیوی بچی مکان سے باہر ہو کر ملبے پر کھڑی ہو گئیں۔ اِدھر ہم باہر ہوئے اُدھر چھت بیٹھ گئی۔[۱۶۶]

غوطے کھاتی ہوئی والدہ، بیوی اور بچی کو بڑی مشکل سے پانی سے نکال کر چھپر پر چڑھایا۔ لیکن صبح ہوتے ہی ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصہ گر پڑا جس کی وجہ سے ندی کا سمٹا ہوا زور دور دور تک پھیل گیا۔ پہلے پانی میں صرف چڑھاو تھا لیکن فصیل گرنے کے بعد روانی اور تیزی بھی آگئی تھی۔ سب کے قدم اکھڑ گئے۔ بچی کو صندوق میں بند کر کے بہانے کی تدبیر بھی کی گئی لیکن سب بے سود۔ جس ڈالی کا سہارا لے کر اب تک بچے

ہوئے تھے وہ بھی ٹوٹ گئی۔ پورا خاندان اسی وقت غرق آب ہو گیا اور خود امجد بڑی مشکل سے اس خوفناک دھارے سے نکل کر کم زور دھارے میں آ پڑے۔ کچھ دور بہنے کے بعد زنانہ ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کر کے انھیں بچایا۔ ان واقعات کی تفصیل خود امجد حیدر آبادی نے ''طغیانی رودِ موسی ۱۳۲۶ھ'' کے عنوان سے جمال امجد میں پیش کی ہے۔[۱۶۷] ان کی نثر کی لطافت، معرفت کے بیش بہا مضامین اور اسلوبِ بیان کی جدت کا اعتراف نصیر الدین ہاشمی نے بھی کیا ہے۔[۱۶۸] رودِ موسی کے واقعے نے امجد کی شاعری میں گہرا اثر ڈالا۔ غم والم اور سوز و گداز ان کی شاعری کا بنیادی موضوع بن گیا۔ یہاں تک کہ رباعیوں میں بھی اس قسم کے موضوعات جگہ بنانے میں کامیاب رہے:

بحر متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دم طرف لحد کھنچا جاتا ہوں
بازارِ فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے میں صرف کفن لے کے چلا جاتا ہوں[۱۶۹]

امجد کی رباعیات، سوز و گداز اور درد والم سے مملو نظر آتی ہیں۔ وہ غم والم کی اس کیفیت کا حکیمانہ استدلال پیش کرتے ہوئے، جس قسم کی توجیہات دیتے ہیں، اس سے ان کی زندگی کے فلسفے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔[۱۷۰] جیسے:

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے[۱۷۱]

وہ پہلے اردو کے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں نام پیدا کیا، اس لیے ان کو ''زندہ سرمد'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری، حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے روحانی طور پر بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کی۔[۱۷۲] ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ۱۳۲۳ھ بمطابق ۱۹۰۵ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی اربابِ نظر نے جان لیا کہ دکن کے افق سے رباعی گوئی کا ایک ایسا روشن ستارہ ابھرنے والا ہے، جس کے آگے دوسرے تمام رباعی گو شعرا کی چمک ماند پڑ جائے گی۔[۱۷۳] دنیا کی بے ثباتی اور ذاتی زندگی کے تلخ تجربات کا اظہار ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ اپنے آشیانے کے اجڑنے کا حال وہ جا بجا بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے:

باد صرصر سے آشیاں گرتا ہے اب لشکر عیش کا نشاں گرتا ہے

اب جاؤں کدھر کہاں پناہ لوں یا رب   پھٹتی ہے زمیں، آسمان گرتا ہے[۱۷۴]

اپنے چمن کی بربادی کا اظہار غزل کی تنگ دامانی میں بھی وہ بڑی خوب صورتی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے:

برباد نہ کر بے کس کا چمن بے درد خزاں سے کون کہے   تاراج نہ کر میرا خرمن اس برقِ تپاں سے کون کہے
مجھ خستہ جگر کی جان نہ لے یہ کون اجل کو سمجھائے   کچھ دیر ٹھہر جا اے دریا، دریائے رواں سے کون کہے[۱۷۵]

طغیانی رودِ موسی کے سانحے کے بعد "امجد کی زندگی رنج والم اور یاس وحرماں کا ایک مجسمہ بن گئی"۔[۱۷۶] ظاہری بات ہے جس شخص کی زندگی میں ایسا حادثہ ہوا ہو، جس میں بیک وقت گھر کے تین افراد موت کی آغوش میں چلے گئے ہوں وہ بھی ایسے کہ ان کی نعش تک نہ ملی ہو۔[۱۷۷] اس صورتِ حال میں یہ رویہ پیدا ہو جانا فطری عمل تھا۔ دیگر اصناف کی طرح امجد کی نظم گوئی میں بھی یہی رویہ موجود ہے۔ "قیامتِ صغریٰ" کے نام سے انھوں نے جو نظم طغیانی رودِ موسی کے سانحے پر لکھی وہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے ریاض امجد میں شامل ہے۔ ریاض امجد کی نظموں میں لطیف احساسات اور انسانی ہمدردی کے وہ نمونے ملتے ہیں جو امجد کے دل کی تڑپ اور روحانی بلندی کا پتا دیتے ہیں۔[۱۷۸] مجموعے کے دیباچے میں عبدالغنی وارثی نے لکھا کہ:

> ہر نظم اعلیٰ اخلاق کی ایک بہترین کتاب ہے۔ طرزِ ادا دلکش، زبان نہایت صاف، مضمون چست اور موثر ہے ... (رودِ موسی کے موضوع پر لکھی گئی نظم) "قیامت صغریٰ" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔[۱۷۹]

اس نظم میں ان کی آپ بیتی بھی ہے رودِ موسی ندی کی طغیانی کے کرب ناک مناظر بھی۔[۱۸۰] دوستوں کی فرمائش پر اس ہولناک واقعے کی تصویر امجد نے بڑے جذباتی انداز سے پیش کی ہے۔ مسدس کی ہیئت میں تخلیق کی گئی نظم "قیامتِ صغریٰ" میں پچیس بند اور "تصویرِ غم" میں نو بند شامل ہیں۔ نظم کیا ہے طغیانیِ رودِ موسی کے پورے واقعے کی منظر کشی ہے۔ کبھی شاعر، بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے اپنا کرب ان اشعار میں پیش کرتے ہیں:

بیٹی! نہ تجھے باپ نے افسوس بچایا   دستِ ستم سے، سیلِ فنا سے نہ چھڑایا
دریا نے ترے حال پہ کچھ رحم نہ کھایا   کیا بھولی سی صورت پہ اسے رحم نہ آیا

یہ جسم ترا پھول سا دیواروں سے ٹکرائے سیلاب میں بہہ جائے تری ننھی سی جاں ہائے[۱۸۱]

اور کبھی پورے کنبے کو اس سیلابی ریلے میں ڈوبتے دیکھ کر بے بسی کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ:

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدۂ پُرنم بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم[۱۸۲]

زندگی کے ستم بالائے ستم اور دکھ کی اس کیفیت کے بیان میں امجد اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بدقسمت انسان سمجھنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ زندگی نے جو دکھ انھیں دیے، وہ دشمنوں کے لیے بھی اس دکھ اور تکلیف سے پناہ چاہتے ہیں:

جو ہم نے سہا ہے نہ سہا ہوگا کسی نے دیکھا ہے جو کچھ ہم نے وہ دشمن بھی نہ دیکھے
کچھ ایسے دیے چرخِ ستمگار نے چرکے یک لخت ہوئے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے[۱۸۳]

مسلسل بارش نے جب سیلاب کی شکل اختیار کر لی اور پانی ہر چیز کو تباہ و برباد کرتا ہوا شہر میں داخل ہوا تو خلقِ خدا کی پریشانی کا عجب ہی منظر تھا۔ ہر کسی کو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی اور لوگ رو رو کر اس مصیبت سے چھٹکارے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ لیکن یہ دعائیں بھی بے اثر ہو چکی تھیں۔ لوگ یکے بعد دیگرے اس سیلاب کی نذر ہوتے جا رہے تھے۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے امجد کا بیان ہے کہ:

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا سیلاب فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گذرتا ہوا پھر سینے تک آیا آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا[۱۸۴]

جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور سوائے حسرت و مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اپنے پیاروں کی نعشیں بھی انھیں نہیں ملتیں تو غم کی شدت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس شدتِ غم میں وہ بے تاب ہو کر اپنی بے بسی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں[۱۸۵]

انفرادی غم جب اجتماعی غم میں تبدیل ہوا اور اس قیامت خیز منظر کو شاعر نے پورے حیدرآباد میں دیکھا تو اسے اپنے غم کا احساس کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ہر جگہ بکھرے ہوئے ملبے کے ڈھیر اور جابجا پھیلے نعشوں کے انبار کو دیکھ کر امجد اس اجتماعی کرب سے دوچار ہوئے جو اس وقت پورے حیدرآباد دکن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کیفیت کا اظہار اپنی ایک اور نظم ''تصویرِ غم'' کے آخری بند میں بھی کرتے ہیں:

ہزاروں گھر ہوئے ظالم اجل کے ہاتھ خراب — فنا کی سینکڑوں چہروں پہ پڑ گئی جلباب
بہت سے ڈوب گئے آفتاب عالم تاب — خدا کسی کو نہ دے داغ فرقتِ احباب[۱۸۶]

یہ نظم اثر پذیری میں اپنا کمال دکھاتی ہوئی حقیقت نگاری اورانسانی رنج والم کے اس احساس کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے جواس زمانے کے حیدرآباد میں بالعموم پایا جاتا تھا۔انھوں نے اس موضوع کے ساتھ پوراپورا انصاف کیا۔نظم کا ہرمصرع اور ہر شعرانتہائی مربوط ہےاورنظم کوپڑھ کرقاری اس واقعے کے ہرمنظرکواپنی نظروں کے سامنے پاتا ہے۔اس نظم کی تاثیرکااندازہ مولانا مناظراحسن گیلانی کے بیان کردہ اس واقعے سے لگایاجاسکتاہے،جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

> حکیم سید محمد احمد، حیدرآباد ایک دفعہ اپنے بال بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ہمارے ہاں سے حضرت امجد کی نظموں کاوہ مجموعہ پڑھنے کے لیے لے گئے جس میں قیامتِ صغریٰ والی مشہورنظم بھی شریک تھی...اس نظم کومولانا سید محمد مرحوم کہتے تھے کہ قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد پڑھنے لگا۔رات کاوقت تھا۔پڑھتے پڑھتے اچانک مجھ پر یہ حالت طاری ہوئی کہ گویا طوفان کاوہی سماں میرے سامنے قائم ہوگیا ہے...اس ہلچل میں مجھ پرایسی بدحواسی چھائی کہ پلنگ سے بے محابا اٹھ کراس چارپائی کی طرف دوڑپڑا،جس پر میری بچی فاطمہ سوئی ہوئی تھی۔وہ سورہی تھی اورمیں بار بار اس کے چہرے کو یہ سوچتے ہوئے دیکھ رہاتھا کہ خدانے بڑافضل کیا۔طوفان کے ریلے میں بہہ جانے سے بچی بچ گئی۔[۱۸۷]

ایسی تاثیر بلاشبہ بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے۔اس تاثیرکوپیدا کرنے میں امجد جیسی جگرسوزی کی ضرورت ہے۔اپنے شعری مجموعے ریاض امجد طبع دوم میں اس نظم کے پس منظر کے بیان میں جوشعرانھوں نے درج کیاہےوہ پوری طرح ان کے حال کی عکاسی کرتا ہے۔شعرملاحظہ کیجیے:

ہیں بدن میں زخم ہزارہا وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں — مرے دردِدل کونہ پوچھیے کہ کہاں ہےاورکہاں نہیں[۱۸۸]

اس کےعلاوہ بھی امجد کے یہاں اس موضوع پر بہت سےاشعارموجود ہیں۔رسالہ ادیب دکن کےطوفان نمبر میں بھی ”نالہ ہائے دردمند“ کے نام سے اُن کا کلام شائع ہوا جوشدتِ احساس اورتاثیرمیں اپنی مثال آپ ہے۔جیسے:

وہ زور شور ندی کا وہ حشر زا طوفان — نزول رحمتِ حق تھا عذاب کی مانند[۱۸۹]

اس سانحے کے بعد شاعر کو جس ذہنی کرب سے گذرنا پڑا اور معاشی تباہی کے بعد جس کسمپرسی کی حالت میں وہ جینے پر مجبور رہوے اس کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی ایک اور نظم ''افسانۂ غم'' میں ان کا بیان ہے کہ:

ہوئی جب خانہ بربادی مری سیلاب موسیٰ سے　　رہا کپڑا پہننے کو نہ کھانے کے لیے ٹکڑا
پریشانی کا عالم، رنج و حسرت، یاس و ناکامی　　دل پر درد میں رہ رہ کے ہر دم درد اٹھتا ہے
زن و فرزند و مادر ہوگئے نذرِ اجل ہے ہے　　کروں کس کس کا ماتم کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا[۱۹۰]

امجد کی حالت زار پر دیگر شعرا نے بھی اشعار کہے ہیں۔بشیر النساء بیگم نے ان کی زندگی کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا:

رود موسیٰ کا وہ طوفاں! اور تنہا تیری جاں　　پانی ہی پانی نظر آتا تھا زیر آسماں[۱۹۱]

اسی طرح ابوسعد اسمٰعیل سید نے بھی اس صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے:

طغیانیِ موسیٰ میں تنہا کر نکلا　　آلام کا طوفان اٹھا کر نکلا
وہ کون؟ وہی شاہِ رباعی امجد　　توحید کی اک راہ دکھا کر نکلا[۱۹۲]

امجد کے علاوہ جن شعرا نے اس موضوع پر عمدہ نظمیں کہیں ان میں ایک نام محبّ حسین محبّ کا بھی ہے۔''مرثیہ شہدائے طغیانی رودِ موسیٰ'' کے نام سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے ان واقعات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔مسدس کی ہیت میں لکھی گئی اس نظم میں ۴۸ بند ہیں۔نظم میں تسلسل کے ساتھ اس پورے واقعے کو پیش کرتے ہوئے تمام جزئیات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آج بھی اس مرثیے کو پڑھ کر اس عہد میں ہونے والی تباہی اور اس کی بحالی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ابتدا میں اس طوفان کی خوفناکی اور تباہی کا حال شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

وہ خوفناک رات قیامت کی وہ سحر　　پھٹتے تھے جس کے ڈر سے فرشتوں کے بھی جگر[۱۹۳]

رودِ موسیٰ کے پلوں کی تباہی اور ندی کے پانی کی بلندی کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

بلدہ پہ قہرِ حق کا نمایاں ہوا اثر　　ندی چڑھی تو ہوش اڑے سب کے سر بسر

طوفانِ نوح آگیا ہر شخص کو نظر تھا ڈوبنے کا شہر کے ہر ایک کو خطر
ڈوبے جو پل تو شور قیامت بپا ہوا بھاگر پڑی تو جان کا خطرہ سوا ہوا[۱۹۴]

لوگ کس طرح اپنی جان بچانے میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں کیا کیا جتن کیے جا رہے تھے اس کی عکاسی شاعر نے کچھ اس طرح کی ہے:

کچھ چڑھ گئے تھے اونچے درختوں پہ جا بجا جڑ سے وہی اکھڑ کے بہے وا مصیبتا
پانی میں ان درختوں کا تھا کچھ عجب سماں شاخوں پہ پھل تھے آدم زندہ ہزارہا[۱۹۵]

گھربار، مال واسباب کی تباہی تو ایک طرف انسانی بے بسی اور بے کسی کی جو داستان یہ طوفان چھوڑ گیا کچھ اس کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

کہتے ہیں لوگ فیل بھی وہ ایک بہہ گئے چوہوں کی طرح ریت میں دب دب کے رہ گئے[۱۹۶]

جس قدر انسانی جانیں اس طوفان کی نذر ہوئیں اور ہلاکتوں کا شمار کرنا جس قدر مشکل ہوا اس کے متضاد دعووں کا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ہزاروں نعشوں کے جا بجا زیاں کو اور ان کی بے حرمتی کو شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

لاشاں پہ لاشے مُردوں پہ مُردے تھے جا بجا جو دب گئے مکانوں میں ان کا نہیں پتا
ندی میں بہہ گئے تھے جو مردے ہزارہا وہ کرگس اور زاغ و زغن کی ہوئی غذا
بہہ بہہ کے مردے ساحل مدراس تک گئے ساتھ ان کے سب مکانوں کی آس اس تک گئے[۱۹۷]

لوٹ مار کرنے والے بے حس لوگ جس طرح موقعہ پرستی کا مظاہرہ کر کے مُردوں کے مال وزر پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اس پر شاعر نے یوں طنز کیا ہے:

بے رحم لوٹنے لگے مُردوں کا مال و زر تھا غم ہر ایک دل میں خوشی تھی نہیں مگر
سمجھے نہ یہ کہ ہم کو بھی در پیش ہے سفر اس حادثے کا بھی نہ ہوا دل پہ کچھ اثر[۱۹۸]

طوفان کے بعد نظام کے حکم سے جو ریلیف کیمپ قائم ہوئے اور امدادی سرگرمیاں شروع ہوئیں اس منظر کو بھی شاعر نے قلم بند کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

کپڑے، ڈوپٹے، ساریاں بٹتی تھیں جا بجا نقد اور ادھار ملتا تھا کپڑے کے بھی سوا

آفت زدوں کی ہر طرح امداد کرتے تھے　　ویراں شدہ مقاموں کو آباد کرتے تھے[۱۹۹]

اس سانحے پر لکھی گئی ایک اور نظم ''سیلِ فنا'' کے نام سے رسالہ ادیـــــب کے طوفان نمبر میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو سید نثار احمد احمدی نے تخلیق کیا۔ شاعر نے دکن میں پیش آنے والے اس واقعے کو ایک ایسا سانحہ قرار دیا ہے، جس کا اثر تا دیر قائم رہے گا:

ظلم و ستم کا تیرے برپا رہے گا ماتم　　عالم میں ہم ہیں جب تک، ہم میں ہے جب تلک دم[۲۰۰]

اس کے علاوہ شاعر نے اس تباہی و بربادی اور انسانی جانوں کے زیاں کو بڑے پُر درد انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسے:

صد حیف وہ ہزاروں گھر بار کا اجڑنا　　اور سطحِ آب پر یوں بہ بہ کے جان دینا
طوفان کی وہ شدت موجوں کے وہ تھپیڑے　　وہ بے کسی کا عالم وہ بے بسی کا مرنا[۲۰۱]

طوفان کی شدت جس قسم کی تباہی و بربادی لائی، اس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے۔ کوئی گھر ایسا نہ بچا کہ جہاں ماتم بپا نہ ہو۔ جہاں جہاں سے اس طوفان کا گذر ہوا ایک دل خراش داستان چھوڑ گیا۔ لوگوں کے آنسو، رو رو کر اس غم میں خشک ہو گئے ۔ اسی لیے شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

پتھرا گئی ہیں آنکھیں آنسو نہیں نکلتے　　ہاتھوں میں بھی نہیں اب سینہ زنی کی طاقت[۲۰۲]

آخر میں شاعر اس ساری تباہی و بربادی کو اپنے اعمال کی سزا قرار دیتے ہوئے سپردگی کے عالم میں یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

ندی کی کیا حقیقت اس کی بساط کیا تھی　　یہ تھی سزا عمل کی یہ مرضیِ خدا تھی[۲۰۳]

طغیانی رودِ موسیٰ کے عنوان سے ایک اور نظم سیف الدین شباب نے تخلیق کی۔[۲۰۴] یہ نظم بھی مسدس کی ہیت میں ہے اور اس میں ۱۴ بند ہیں۔ اس نظم میں بھی رودِ موسیٰ کے واقعے کو پُر درد انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کے آغاز کا بند ہی اپنے موضوع کی پوری وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

صبح دو شنبہ آہ آفت تھی مجبر آمد قیامت تھی
نذرِ سیلاب لوگ آہ ہوئے کیسے کیسے مکاں تباہ ہوئے[۲۰۵]

شاعر نے اس واقعے کو قیامت سے تشبیہ دیتے ہوئے گھر گھر سے اٹھنے والی آہ و بکا کو بڑے

موثر انداز سے پیش کیا ہے جیسے:

سچ تو یہ ہے کہ روز محشر تھا   نفسی نفسی کا شور گھر گھر تھا[۲۰۶]

ایک اور نظم سید ظفر حسن عبرت نے ''انقلاب دہر'' کے نام سے لکھی۔[۲۰۷] چھ بند پر مشتمل اس نظم میں حیدر آباد دکن کی تباہی و بربادی کا پُر سوز بیان موجود ہے۔ وہ شہر جس کی رونق اور ترقی کی مثالیں پورے ہندوستان میں دی جاتی تھیں۔ یک لخت وہاں ویرانیوں نے بسیرا کر لیا۔ اس انقلاب پر شاعر کا بیان ہے کہ:

اے سواد حیدرآباد اے مقام مغتنم   بن گیا تو دفعتاً کیوں منبع درد و الم
آہ تجھ کو کھا گئی کیوں رودِ موسیٰ کی نظر   انقلاب دہر نے کیوں تجھ پہ توڑا یہ ستم
ہائے وہ رعنائیاں نقشِ مثالی ہو گئیں   حسن جوبن کی بہاریں سب خیالی ہو گئیں[۲۰۸]

نظم میں شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ماضی کے حیدرآباد کا موازنہ طغیانی کے بعد کے حیدرآباد سے کیا ہے اور اس اجڑے چمن پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے ہیں۔ جس طرح حیدرآباد کی تہذیبی زندگی تباہ ہوئی اور معاشی بد حالی نے لوگوں کے گھروں میں دستک دی اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

یک بیک یارب زمانے نے جو لی کروٹ بدل   سب ہمارے عیش و راحت کا گیا کس بل نکل[۲۰۹]

محمد عبدالکریم خاں صبؔر دہلوی نے بھی ''فسانۂ عبرت''[۲۱۰] کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ شاعر نے رودِ موسیٰ کی طغیانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کو بہت تفصیل سے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں طوفان کی ہولناک تباہی اور آخر میں امدادی سرگرمیوں کی روداد پیش کی گئی ہے۔ خود شاعر بھی اس سانحے کے موقعے پر محلہ محبوب شاہی پٹیلہ برج میں مقیم تھے لیکن اتوار کو جب پانی چڑھنا شروع ہوا تو سارے محلے والے گھر بار چھوڑ کر محفوظ مقام کی طرف نکل گئے تھے۔[۲۱۱] نظم میں شعری حسن کی کمی ہے۔ لیکن شاعر نے چونکہ اس پورے واقعے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا لہٰذا پوری تفصیل اس نظم میں بیان کی ہے۔ اس طغیانی کو وہ عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس سانحے کو ساری عمر نہیں بھول پائیں گے۔

یوں تو اس کے واقعے جتنے ہیں سب ہیں پُر اثر   میں نے جو دیکھا نہیں بھولوں گا اس کو عمر بھر[۲۱۲]

سید علی حیدر طباطبائی نے ''شہر آشوب''[۲۱۳] کے عنوان سے مختلف اشعار اور قطعات کو یکجا کیا ہے۔ جان و مال کی تباہی کے ساتھ ساتھ نادر و نایاب جواہر اور کتب خانوں کی بربادی پر وہ نوحہ کناں ہیں:

مرنے سے بچے جو وہ ہیں محتاج و فقیر　　سیلاب میں ہو گیا تلف مالِ خطیر
نادر وہ جواہر کہ نہ تھا جن کا نظیر　　بے مثل کتابیں کہ نہ تھا جن کا شمار[۲۱۴]

اس کے علاوہ محمد احمد علی جودتؔ نے ''قیامت صغریٰ''[۲۱۵] کے نام سے چھوٹی بحر کی ایک نظم لکھی جس میں اس انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

کل جنھیں دنیا کی نعمت تھی نصیب　　در بدر ہیں آج محتاج و غریب[۲۱۶]

فاروق شاہ پوری کی نظم ''حیدرآباد کی تباہی''[۲۱۷] کے عنوان سے زمانہ کان پور میں شائع ہوئی۔ شاعر نے اسے اپنے دردبھرے دل کی صدا قرار دیا اور اس تباہی پر آنسو بہائے۔ جس طرح ایک ہنستا بستا شہر طغیانی کے بعد اجڑے دیار کا نقشہ پیش کر رہا تھا، اس کی تصویر کشی کی ہے:

بن گیا ہے رنج و مایوسی کی اک تصویر تو　　تیری صورت سے عیاں ہیں حسرت و غم کے نشاں
آہ کس کے سوگ نے تجھ کو کیا ہے سوگوار　　اشک خونیں دیدۂ تر سے ترے ہیں کیوں رواں[۲۱۸]

اس تباہی کا دردناک منظر پیش کرتے ہوئے شاعر نے بڑے جذباتی انداز میں اس شہر کی رفعت و شان کو نہ صرف بیان کیا بلکہ ماضی اور حال سے دریچوں میں جھانک کر ان مناظر کو بڑے مؤثر انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عظمت جس کا اب نشان تک باقی نہیں رہا، اس عظمتِ رفتہ کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

نذرِ سیلِ آب موسیٰ ہوگئے یہ سب کے سب　　مٹ گئے پانی کے ہاتھوں تیری عظمت کے نشاں[۲۱۹]

اس عظیم سانحے پر پورے ہندوستان میں جو ردِعمل سامنے آیا اور لوگ جس طرح سوگوار ہوئے اس بابت شاعر کا بیان ہے کہ:

مشتہر ہے تیری بربادی کا قصہ چار سو　　خون کے آنسو رلاتی ہے یہ تیری داستاں
صفحۂ تاریخ رنگیں ہوں گے تیرے ذکر سے　　خوں سے لکھا جائے گا تیری تباہی کا بیاں[۲۲۰]

''سیلِ فنا'' کے نام سے ایک اور نظم مرزا نظام شاہ لبیب گورگانی دہلوی نے بھی لکھی۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم کے آٹھ بند ہیں۔ نظم میں فنی خامیاں موجود ہیں لیکن اس واقعے پر ایک حساس دل کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔ اس طغیانی کی شدت کے بیان کو دیکھیے:

شورِ طوفاں سے لرزتے تھے جبال و کہسار　　صور پھنکنے کا گماں ہوتا تھا سب کو ہر بار

تھے اذا زلزلت الارض کے پیدا آثار   نفسی نفسی کی صدا ہوتی تھی گردوں کے پار[۲۲۱]

حامد حسن قادری نے بھی ''سیلاب'' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ نظم اصل میں تو رام پور میں آنے والے سیلاب سے متاثر ہو کر لکھی گئی لیکن اس ضمن میں شاعر حیدرآباد دکن میں آنے والی تباہی کو بھی فراموش نہ کر سکے۔ لہٰذا وہ سیلاب کی غضبناکی کا حال بیان کرتے ہوئے بے اختیار یہ اشعار پیش کرنے پر مجبور ہوئے:

تیری ٹکر سے نہ سنبھلا حیدرآباد آج تک   ہو سکے ہرگز نہ سب اوجڑے گھر آباد آج تک
کل کیا تھا تو نے اس کا شیشۂ دل چور چور   آج تیرے ہاتھ سے ہے چاک داماں رام پور[۲۲۲]

ماہر کلشوری نے اپنی ایک مختصر نظم میں اس واقعے کی مادہ تاریخ بھی نکالی ہے:

پیر گردوں کچھ خبر بھی ہے تجھے کیا ہوگیا   سینکڑوں گھر گر گئے اک حشر برپا ہوگیا
سنگ دل روتے ہیں ماہر دیکھ کر اس حال کو   کھا گئی کس کی نظر یہ شہر کو کیا ہوگیا[۲۲۳]

(۱۳۱۷ف)

غرض کہ ایک صدی قبل پیش آنے والا یہ واقعہ حیدرآباد دکن کی تاریخ کا وہ الم ناک سانحہ ہے جس کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے اور جس کے جگر خراش اور دردناک واقعات کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ زمانہ ہزاروں رنگ بدلتا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ اس قسم کے تغیرات، انقلابات اور سانحات ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ سانحات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر چار پشت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ ایسے ہی سانحات میں طغیانی رودِ موسی کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ طغیانی کی مفصل واقعات اور شاعری میں اس واقعے کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ مقالے کو ریسرچ جنرل کی مناسبت سے مختصر کیا گیا ہے امید ہے کہ بعد میں اس موضوع کو تفصیل سے کتابی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ ان واقعات کی مزید تفصیل ملاحظہ کرنا مقصود ہو تو رسالہ ادیب دکن کا طوفان نمبر ۱۹۰۸ء، بہار خزاں حیدر آباد یعنی طغیانی رودِ موسی مؤلفہ و مصنفہ مولوی سید محمد حسین صاحب اغلب موہانی اور اخبار مشیر دکن کی فائل بابت ۱۹۰۸ء–۱۹۰۹ء ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔[۲۲۴]

حواشی

* صدر شعبۂ اردو، کراچی گرامر اسکول، کراچی۔

۱۔ وحیدہ نسیم، "پیش لفظ" موسیٰ کے کنارے مصنفہ حبیبہ قاضی (کراچی: گلستان مصطفےٰ، ۱۹۹۱ء): ص ۵۔

۲۔ بہت سے ادبا اور شعرا نے اس ندی کو "موسیٰ ندی" بھی لکھا ہے لیکن اصل نام "موسیٰ" ہی ہے۔ دیکھیے: تاریخ گلزار آصفیہ مصنف خواجہ غلام حسین خاں (حیدرآباد دکن: مطبع محمدی، ۱۳۰۸ھ)، ص ۵۵۰۔

۳۔ وحیدہ نسیم، ص ۶۔

۴۔ سید خورشید علی، "حیدرآباد کی حسرت ناک تباہی" مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء): ص ۲–۳۔

۵۔ وحیدہ نسیم، ص ۶۔

۶۔ سید خورشید علی، ص ۶۔

۷۔ فخر الدین ارمان، "رود موسیٰ" سب رس دکن (جنوری ۱۹۳۹ء): ص ۱۹۷۔

۸۔ مرزا ظفر الحسن، دکن اداس ہے یارو (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۷۸ء)، ص ۳۹۔

۹۔ ظفر علی خان، "رود موسیٰ" مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (جنوری ۱۹۰۵ء): ص ۱–۲۔

۱۰۔ فخر الدین ارمان، ص ۱۹۷۔

۱۱۔ سید خورشید علی، ص ۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۔

۱۳۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، بستانِ آصفیہ حصہ اوّل (حیدرآباد دکن: مطبع انوار الاسلام، ۱۳۲۷ھ)، ص ۸۰۲۔

۱۴۔ خواجہ غلام حسین خاں، تاریخ گلزار آصفیہ، ص ۵۵۰۔

۱۵۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص ۸۰۲۔

۱۶۔ سید خورشید علی، ص ۸۔

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص ۸۰۲–۸۰۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۰۵۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ نعمت علی خاں عالی، بحوالہ سید خورشید علی، ص ۲۷–۲۸۔

۲۲۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص ۸۰۵۔

۲۳۔ علامہ نجم الغنی خاں، تاریخ ریاست حیدرآباد (لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۳۰ء)، ص ۵۶۷۔

۲۴۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص ۸۰۵۔

۲۵۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص ۵۶۷۔

۲۶۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص ۸۰۵۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۰۶۔

۲۸۔ سید خورشید علی، ص۸۔

۲۹۔ نواب ضرغام الدولہ بہادر، بحوالہ بستانِ آصفیہ ص۸۰۷۔

۳۰۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۶۔

۳۱۔ نواب ضرغام الدولہ بہادر، بحوالہ بستانِ آصفیہ ص۸۰۶–۸۰۷۔

۳۲۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۸۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ سید خورشید علی، ص۸۔

۳۶۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۸۔

۳۷۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۷۔

۳۸۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۸۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: رسالہ ادیب دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)، ص۸۔

۳۹۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۲۔

۴۰۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۶۷ء)، ص۳۸۔

۴۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص۴۸۔

۴۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، میری داستان (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء)، ص۹۸۔
اس کے علاوہ حیدرآباد دکن کے تمام مؤرخین نے یہی سن درج کیا ہے۔

۴۳۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۹۔

۴۶۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۴۷۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۵۔

۴۸۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۰۹۔

۴۹۔ سید خورشید علی، ص۲۔

۵۰۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۴۔

۵۱۔ سید محمد فاروق، ''حیدرآباد کی تباہی'' مشمولہ رسالہ کانپور (دسمبر ۱۹۰۸ء)، ص۳۱۵۔

۵۲۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۲۔

۵۳۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۰۔

ان کی بات اس لیے بھی معتبر مانی جائے گی کہ ان کی تصنیف بستانِ آصفیہ اس سانحے کے صرف ایک برس بعد ۱۳۲۷ھ میں منظرِ عام پر آئی جب کہ نجم الغنی خاں صاحب کی تصنیف تاریخ ریاستِ حیدرآباد اس سانحے کے ۲۲ برس بعد ۱۹۳۰ء میں شائع

ہولی۔

۵۴۔ سید خورشید علی، ص۵۔

۵۵۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۵۶۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، رباعیاتِ امجد (حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۴۲ھ)، ص۵۳۔

۵۷۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۰۔

۵۸۔ محب حسین محب، ''مرثیہ شہدائے طغیانی رودموسی'' مشمولہ ادیبِ دکن (۱۹۰۸ء): ص۹۵۔

۵۹۔ سید خورشید علی، ص۵۔

۶۰۔ عبدالحلیم شرر، ''موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!'' مشمولہ دل گداز حیدرآباد دکن (اکتوبر ۱۹۰۸ء): ص۶۔

۶۱۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۰۔

۶۲۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۵۔

۶۳۔ سید خورشید علی، ص۱۰۔

۶۴۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۰–۸۱۱۔

۶۵۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۲۔

۶۶۔ ایضاً۔

۶۷۔ سید خورشید علی، ص۱۲۔

۶۸۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۶۹۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۹۹۔

۷۰۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۱۔

۷۱۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۷۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۷۔

۷۳۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۷۴۔ سید خورشید علی، ص۱۴۔

۷۵۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۳۔

۷۶۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۱۔

۷۷۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۵۔

۷۸۔ سید خورشید علی، ص۴۲۔

۷۹۔ ایضاً، ص۱۷–۲۶۔

۸۰۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۶۴۔

۸۱۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۱–۸۱۲۔

۸۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۲۔

۸۳۔ سید خورشید علی، ص۲۹–۴۱۔

۸۴۔ محمد الدین فوق، "ظفر علی خاں" مشمولہ اخبار نویسوں کے حالات (لاہور: مطبوعہ رفاہِ عام اسٹیم پریس، ۱۹۱۲ء)، ص۱۲۔

۸۵۔ شفقت رضوی، "مولانا ظفر علی خاں کا تعلق ریاست حیدرآباد سے" مشمولہ خدا بخش جرنل پٹنہ (اپریل، جون ۲۰۰۹ء): ص۵۶۔

۸۶۔ مرزا اکبر علی بیگ، محمد عزیز مرزا: شخصیت، حیات اور کارنامے (حیدرآباد دکن: ادارۂ شعر و حکمت، ۱۹۸۷ء)، ص۱۲۶۔

۸۷۔ محمد الدین فوق، ص۱۲۔

۸۸۔ نواب وقار الملک، "دیباچہ" مشمولہ خیالات عزیز مرتب منشی دیا نرائن نگم (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء)، ص۱۲–۱۵۔

۸۹۔ مرزا اکبر علی بیگ، ص۱۲۶۔

۹۰۔ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین حصہ دوم (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۲۸ء)، ص۲۶۶۔

۹۱۔ نواب وقار الملک، ص۱۵۔

۹۲۔ شفقت رضوی، ص۵۵–۵۶۔

۹۳۔ نواب وقار الملک، ص۱۵۔

۹۴۔ شفقت رضوی، ص۵۶۔

۹۵۔ نواب وقار الملک، ص۱۵۔

۹۶۔ محمد یحییٰ تنہا، ص۲۶۷۔

۹۷۔ نواب وقار الملک، ص۱۵۔

۹۸۔ مرزا اکبر علی بیگ، ص۱۲۷۔

۹۹۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۲۶۔

۱۰۰۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص۱۰۷۔

۱۰۱۔ سید خورشید علی، ص۴۲–۵۳۔

۱۰۲۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۶۔

۱۰۳۔ مرزا اکبر علی بیگ، ص۱۲۶۔

۱۰۴۔ مانک راؤ وٹھل راؤ، ص۸۱۷۔

۱۰۵۔ بحوالہ سید خورشید علی، ص۴۳۔

۱۰۶۔ عبد الحلیم شرر، ص۴–۵۔

۱۰۷۔ علامہ نجم الغنی خاں، ص۵۲۵۔

۱۰۸۔ سید خورشید علی، ص۴۳۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۶۲–۹۷۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۲–۳۔

۱۱۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۱۰۵۔

۱۱۲۔ عبدالحلیم شرر، ص ۱-۲۔

۱۱۳ ایضاً، ص ۳۔

۱۱۴۔ شورش کاشمیری، "مولانا ظفر علی خاں" مشمولہ نقوش لاہور شخصیات نمبر (۱۹۵۶ء)، ص ۵۹۸۔

۱۱۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر (لاہور: مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء)، سرورق کی پشت۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔

۱۱۷۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، سرورق کی پشت اور مندرجات سے پہلے والے صفحے پر سن درج ہے۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۱۱۹۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۱۵۴۔

۱۲۰۔ مولانا ظفر علی خاں، "دکن ریویو کی عزت افزائی" مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (مارچ ۱۹۰۵ء)، ص ۳۵۔
اس میں دو خطوط شائع ہوئے، پہلا خط نور اللہ اور دوسرا مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔

۱۲۱۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ، "دکن ریویو کی عزت افزائی" خط مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (مارچ ۱۹۰۵ء)، ص ۳۵۔

۱۲۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار، ص ۴۸۔

۱۲۳۔ مولانا ظفر علی خاں، "رود موسیٰ" مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (جنوری ۱۹۰۵ء)، ص ۱-۲۔

۱۲۴۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۱۸۳۔

۱۲۵۔ مولانا ظفر علی خاں، "رود موسیٰ"، ص ۱۔

۱۲۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے یہ نظم مخزن دہلی کے شمارے جنوری ۱۹۰۹ء سے نقل کی ہے لیکن سہواً یہ مصرع "تو وضع ایزدی ہے جو شان داوری ہے" درج کیا ہے جب کہ درست مصرع وہی ہے جو مقالے میں درج ہے۔ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۳۳۷۔

۱۲۷۔ مولانا ظفر علی خاں، "رود موسیٰ"، ص ۲۔

۱۲۸۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۱۸۴۔

۱۲۹۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر" مشمولہ بہارستان (لاہور: مکتبۂ کاروان، سن ندارد)، ص ۱۰-۱۲۔

۱۳۰۔ موازنے کے لیے دیکھیے: بہارستان میں شامل نظم "شورِ محشر" کا مطلع نمبر ۱۰ تا ۱۲ اور مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء)، ص ۶۶-۷۰۔

۱۳۱۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی، مرتب بہارستان، ص ۱۔

۱۳۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۶۷۔

۱۳۳۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی، ص ۱۔

۱۳۴۔ زمیندار (۱۴ جولائی ۱۹۲۴ء)۔

۱۳۵۔ محمد الدین فوق، ص ۱۴۔

۱۳۶۔ ڈاکٹر غلام حسین خاں ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار، ص ۴۹۔

۱۳۷۔ محمد الدین فوق، ص ۱۲۔

۱۳۸۔ ڈاکٹر غلام حسین خاں ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار، ص ۴۸۔

۱۳۹۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر" مشمولہ مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء)، ص ۶۶–۷۰۔

۱۴۰۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۳۳۵–۳۳۲۔

۱۴۱۔ سر عبدالقادر، "شورِ محشر" مشمولہ مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء)، ص ۶۶۔

۱۴۲۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۶۶۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۶۷۔

۱۴۴۔ موازنے کے لیے نظم "روداد سوئی" مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (جنوری ۱۹۰۵ء) اور "شورِ محشر" مشمولہ مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء) ملاحظہ کیجیے۔

۱۴۵۔ نظم "روداد سوئی" کے وہ سات اشعار جو "شورِ محشر" میں شامل نہیں، دیکھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے: دکن ریویو حیدرآباد دکن (جنوری ۱۹۰۵ء)، ص ۱–۲۔

۱۴۶۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۶۸۔

۱۴۷۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار، ص ۵۲۔

۱۴۸۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۶۸۔

۱۴۹۔ ایضاً۔

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۱۵۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۳۳۹ میں سہواً یہ مصرع "گم ہوئی ہے خلقت، ہوش، حواس ہیں شل" درج ہے۔ اسی وجہ سے یہ مصرع وزن سے بھی گر گیا ہے۔

۱۵۲۔ درست شعر کے لیے ملاحظہ کیجیے ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۶۹۔

۱۵۳۔ ظفر علی خاں کے مجموعۂ کلام بہارستان میں یہ مصرع اس طرح درج ہے: "ہر گھر میں ہر کھنڈر میں لاشے پڑے ہوئے ہیں"، دیکھیے، ص ۱۲۔ جب کہ مخزن (جنوری ۱۹۰۹ء)، ص ۶۹ اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی مذکورہ بالا تصنیف ظفر علی خان: ادیب و شاعر کے ص ۳۳۹ میں یہ مصرع اس طرح درج ہے جیسا کہ راقم نے مقالے میں درج کیا ہے۔

۱۵۴۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۶۹۔

۱۵۵۔ ایضاً۔

۱۵۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار، ص ۵۴۔

۱۵۷۔ مولانا ظفر علی خان، "شورِ محشر"، ص ۷۰۔

۱۵۸۔ ایضاً۔

۱۵۹۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان: ادیب و شاعر، ص ۶۷۔

۱۶۰۔ مولانا ظفر علی خاں، "شورِ محشر"، ص ۷۰۔

۱۶۱۔ ایضاً۔

۱۶۲۔ پروفیسر سید محمد، "امجد، جواب سرمد" مشمولہ سب رس دکن امجد نمبر (مئی، جون ۱۹۶۲ء) ص ۱۳۔

۱۶۳۔ عظیم الدین محبت، "امجد بحیثیت غزل گو" سب رس دکن (۱۹۶۲ء) ص ۳۶۔

۱۶۴۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، بحوالہ عظیم الدین محبت، ص ۳۶۔

۱۶۵۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی ایک تعارف (کراچی: بہادریار جنگ اکیڈمی، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۸۔

۱۶۶۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، جمال امجد (دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۴۸ء)، ص ۸۵–۸۷۔

۱۶۷۔ ایضاً، ص ۸۸–۹۲۔

۱۶۸۔ نصیر الدین ہاشمی، "مقدمہ" مکتوبات امجد مرتبہ نصیر الدین ہاشمی (حیدرآباد دکن: شمس المطابع، ۱۳۳۵ھ) ص ۸۔

۱۶۹۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، رباعیات امجد (کراچی: احمد برادرز، ۱۹۶۸ء)، ص ۵۸۔

۱۷۰۔ منیز جانو کاؤس جی، "امجد بحیثیت رباعی گو شاعر" مشمولہ ارمغان امجد مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد (حیدرآباد دکن: ادارۂ ادبیات اردو، ۱۹۵۹ء) ص ۳۶۔

۱۷۱۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، رباعیات امجد (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۶۰ء)، ص ۸۳۔

۱۷۲۔ خواجہ حمید الدین شاہد، "دکن کا نامور شاعر" مشمولہ ارمغان امجد، ص ۲۹۔

۱۷۳۔ پروفیسر سید محمد، ص ۱۳۔

۱۷۴۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، جمال امجد، ص ۱۲۔

۱۷۵۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، اردو شاعری کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (نئی دلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۹۴۔

۱۷۶۔ نصیر الدین ہاشمی، "امجد حیدرآبادی" مشمولہ یادگار امجد مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی (حیدرآباد دکن: مطبع ابراہیمیہ، ۱۹۶۴ء)؛ ص ۲۶۔

۱۷۷۔ نصیر الدین ہاشمی، "امجد حیدرآبادی" مشمولہ نقوش لاہور شخصیات نمبر اوّل (جنوری ۱۹۵۶ء)؛ ص ۳۳۲۔

۱۷۸۔ پروفیسر سید محمد، ص ۱۳۔

۱۷۹۔ عبدالغنی وارثی، "دیباچہ" مشمولہ رباعی امجد (حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۳۲ھ) ص ۲۔

۱۸۰۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی ایک تعارف، ص ۵۸۔

۱۸۱۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، رباعی امجد، ص ۵۴۔

۱۸۲۔ ایضاً۔

۱۸۳۔ ایضاً، ص ۵۲–۵۳۔

۱۸۴۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، رباعی امجد (حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۳۵ھ)، ص ۵۶۔

۱۸۵۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۱۸۶۔ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، "تصویر غم"، ص ۲۹۔

۱۸۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، "حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی اور فقیر گیلانی" مشمولہ سب رس حیدرآباد دکن ش ۷–۸ جلد ۱۹، امجد

نمبر (سن ندارد)؛ ص۵۲۔

۱۸۸۔ سید احمد حسین امجد حیدر آبادی، رباعیاتِ امجد، ص۵۲۔

۱۸۹۔ سید احمد حسین امجد حیدر آبادی، "نالۂ ہائے دردمند" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۹۳۔

۱۹۰۔ سید احمد حسین امجد حیدر آبادی، "افسانۂ یتیم" مشمولہ مخزن لاہور (فروری ۱۹۰۹ء)؛ ص۱۳۲۔

۱۹۱۔ بشیر النساء بیگم، "یادِ امجد" مشمولہ سب رس کراچی امجد نمبر (۱۹۶۳ء)؛ ص۱۰۲۔

۱۹۲۔ سید اسمٰعیل ابوسعد "شاعرِ باقی، امجد" مشمولہ سب رس کراچی امجد نمبر (۱۹۶۳ء)؛ ص۱۱۸۔

۱۹۳۔ محبت حسین محبت، "مرثیۂ شہدائے طغیانی رود موسیٰ" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۹۲۔

۱۹۴۔ ایضاً، ص۹۳۔

۱۹۵۔ ایضاً، ص۹۲۔

۱۹۶۔ ایضاً، ص۹۷۔

۱۹۷۔ ایضاً، ص۸۹۔

۱۹۸۔ ایضاً، ص۸۹–۹۰۔

۱۹۹۔ ایضاً، ص۹۰۔

۲۰۰۔ سید نثار احمد احمدی، "سیلِ فنا" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۹۶۔

۲۰۱۔ ایضاً، ص۵۶–۹۵۔

۲۰۲۔ ایضاً، ص۹۶۔

۲۰۳۔ ایضاً، ص۹۷۔

۲۰۴۔ سیف الدین شباب، "سیلِ فنا" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۹۸–۱۰۱۔

۲۰۵۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۲۰۶۔ ایضاً، ص۹۹۔

۲۰۷۔ سید ظفر حسن عبرت، "انقلابِ دہر" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۱۰۲–۱۰۳۔

۲۰۸۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۲۰۹۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۲۱۰۔ عبدالکریم خاں صبر دہلوی، "قصائدِ عبرت" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۱۱۳–۱۲۰۔

۲۱۱۔ عبدالکریم خاں صبر دہلوی، "حواشی"، ص۱۱۷۔

۲۱۲۔ عبدالکریم خاں صبر دہلوی، "قصائدِ عبرت"، ص۱۱۵۔

۲۱۳۔ سید علی حیدر طباطبائی، "شہر آشوب" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۷۳–۸۱۔

۲۱۴۔ ایضاً، ص۸۰۔

۲۱۵۔ محمد احمد علی جودت، "قیامتِ صغریٰ" مشمولہ ادیب حیدر آباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص۱۳۱–۱۳۲۔

۲۱۶۔ ایضاً، ص۱۳۲۔

۲۱۷۔ فاروق شاہ پوری۔ "حیدرآباد کی تباہی" مشمولہ زمانہ کان پور (دسمبر ۱۹۰۸ء)؛ ص ۳۱۵-۳۱۶۔

۲۱۸۔ ایضاً، ص ۳۱۵۔

۲۱۹۔ ایضاً، ص ۳۱۶۔

۲۲۰۔ ایضاً۔

۲۲۱۔ مرزا نظام شاہ لبیب کورنگانی دہلوی۔ "سیل فنا" مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن (ستمبر ۱۹۰۹ء)؛ ص ۳۵۔

۲۲۲۔ حامد حسن قادری۔ "سیلاب" مشمولہ زمانہ کان پور (ستمبر ۱۹۰۹ء)؛ ص ۳۰۷۔

۲۲۳۔ ماہر لکھوری۔ "تاریخ ہائے طغیانی" مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)؛ ص ۱۳۲۔
یہ مادہ تاریخ فاطمی تقویم کے مطابق ہے۔

۲۲۴۔ مائیک راؤ وجل راؤ، ص ۸۲۲۔

مآخذ

ابوسعد، سید اسمٰعیل۔ "شاہ رباعی، امجد"۔ مشمولہ سب رس کراچی امجد نمبر (۱۹۶۲ء)۔

احمدی، سید نثار احمد۔ "سیل فنا"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

ارمان فخر الدین۔ "رود موسیٰ"۔ سب رس دکن (جنوری ۱۹۳۹ء)۔

امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین۔ رباعیات امجد۔ کراچی: احمد برادرز، ۱۹۶۸ء۔

____________۔ رباعیات امجد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۲۰ء۔

____________۔ "نالۂ ہائے دردمند"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

____________۔ "افسانۂ غم"۔ مشمولہ زمانہ کان پور (فروری ۱۹۰۹ء)۔

____________۔ جمال امجد۔ دکن: اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۳۸ء۔

____________۔ ریاض امجد۔ حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۳۲ھ۔

____________۔ ریاض امجد۔ حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۳۵ھ۔

____________۔ اردو شاعری کا انتخاب۔ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۳ء۔

بشیر النساء بیگم۔ "یاد امجد"۔ مشمولہ سب رس کراچی امجد نمبر (۱۹۶۲ء)۔

بیگ، مرزا اکبر علی۔ محمد عزیز مرزا: شخصیت، حیات اور کارنامے۔ حیدرآباد دکن: ادارۂ شعر و حکمت، ۱۹۸۷ء۔

بیگ، مرزا فرحت اللہ۔ میری داستان۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء۔

تنہا، محمد یحییٰ۔ سیر المصنفین۔ حصہ دوم۔ دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۲۸ء۔

جودت، محمد احمد علی۔ "قیامت صغریٰ"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

حالی، مولانا الطاف حسین۔ "دکن ریویو کی عزت افزائی"۔ خط مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (مارچ ۱۹۰۵ء)۔

خاں، مولانا ظفر علی۔ "شور محشر"۔ مشمولہ مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء)۔

____________۔ "دکن ریویو کی عزت افزائی"۔ مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (مارچ ۱۹۰۵ء)۔

________۔ "روسیاہی"۔ مشمولہ دکن ریویو حیدرآباد دکن (جنوری ۱۹۰۵ء)۔

________۔ "شورِ محشر"۔ مشمولہ بہارستان۔ لاہور: مکتبۂ کاروان، سن ندارد۔

خاں، علامہ نجم الغنی۔ تاریخ ریاست حیدر آباد۔ لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۳۰ء۔

ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین۔ مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔

__________۔ ظفر علی خان: ادیب و شاعر۔ لاہور: مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء۔

راؤ، مانک راؤ وٹھل۔ بستان آصفیہ۔ حصہ اوّل۔ حیدرآباد دکن: مطبع انوار الاسلام، ۱۳۲۷ھ۔

رضوی، شفقت۔ "مولانا ظفر علی خاں کا تعلق ریاست حیدرآباد سے"۔ مشمولہ خدا بخش جنرل پٹنہ (اپریل، جون ۲۰۰۹ء)۔

زمیندار (۱۴ جولائی ۱۹۲۴ء)۔

شاہد، خواجہ حمید الدین۔ حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی ایک تعارف۔ کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۹۳ء۔

________۔ "دکن کا نامور شاعر"۔ مشمولہ ارمغان امجد۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد۔ حیدرآباد دکن: ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۹ء۔

شباب، سیف الدین۔ "سیل فنا"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

شرر، عبدالحلیم۔ "موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!"۔ مشمولہ دل گداز حیدرآباد دکن (اکتوبر ۱۹۰۸ء)۔

صبر دہلوی، عبدالکریم خاں۔ "قسا بعبرت"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

ضرغام الدولہ، نواب بہادر۔ بستان آصفیہ۔ حیدرآباد دکن: مطبع نور الاسلام، ۱۳۲۷ھ۔

طباطبائی، سید علی حیدر۔ "شہر آشوب"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

ظفر الحسن، مرزا۔ دکن اداس ہے یارو۔ کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۷۸ء۔

عالی، نعمت علی خاں۔ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

عبدالقادر، سر۔ "شور محشر"۔ مشمولہ مخزن دہلی (جنوری ۱۹۰۹ء)۔

عبرت، سید ظفر حسن۔ "انقلاب دہر"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

علی، سید خورشید۔ "حیدرآباد کی حسرت ناک تباہی"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔

غلام حسین خاں، خواجہ۔ تاریخ گلزار آصفیہ۔ حیدرآباد دکن: مطبع محمدی، ۱۳۰۸ھ۔

فاروق، سید محمد۔ "حیدرآباد کی تباہی"۔ مشمولہ زمانہ کانپور (دسمبر ۱۹۰۸ء)۔

فاروق، شاہ پوری۔ "حیدرآباد کی تباہی"۔ مشمولہ زمانہ کانپور (دسمبر ۱۹۰۸ء)۔

فوق، محمد الدین۔ "ظفر علی خاں"۔ مشمولہ اخبار نویسوں کے حالات۔ لاہور: مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس، ۱۹۱۲ء۔

قادری، حامد حسن۔ "سیلاب"۔ مشمولہ زمانہ کانپور (ستمبر ۱۹۰۹ء)۔

کاشمیری، شورش۔ "مولانا ظفر علی خاں"۔ مشمولہ نقوش لاہور شخصیات نمبر (۱۹۵۶ء)۔

کاؤس جی، میہر وبانو۔ "امجد بحیثیت رباعی گو شاعر"۔ مشمولہ ارمغان امجد۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد۔ حیدرآباد دکن: ادارۂ ادبیات اردو، ۱۹۵۹ء۔

گیلانی، مولانا مناظر احسن۔ "حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی و فقیر گیلانی"۔ مشمولہ سب رس حیدرآباد دکن ش ۷-۸ جلد ۱۹، امجد نمبر (سن ندارد)۔

لبیب کورگانی دہلوی، مرزا نظام شاہ۔ "سیل فنا"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن (ستمبر ۱۹۰۹ء)۔
ماہر کنتوری۔ "تاریخ ہائے طغیانی"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔
محبّ حسین محبّ۔ "مرثیہ شہدائے طغیانی رود موسیٰ"۔ مشمولہ ادیب حیدرآباد دکن طوفان نمبر (۱۹۰۸ء)۔
محبت، عظیم الدین۔ "امجد بحیثیت غزل گو"۔ سب رس دکن (۱۹۶۲ء)۔
محمد، پروفیسر سید۔ "امجد، جواب سرمد"۔ مشمولہ سب رس دکن امجد نمبر (مئی، جون ۱۹۶۲ء)۔
نسیم، وحیدہ۔ "پیش لفظ"۔ موسی کے کنارے۔ مصنفہ حبیبہ قاضی۔ کراچی: گلستان مصطفےٰ، ۱۹۹۱ء۔
نظیر لدھیانوی، اصغر حسین خاں۔ بہارستان۔ لاہور: مکتبہ کاروان، سن ندارد۔
وارثی، عبدالغنی۔ "دیباچہ"۔ مشمولہ رباعیات امجد۔ حیدرآباد دکن: عماد پریس، ۱۳۴۲ھ۔
وقار الملک، نواب۔ "دیباچہ"۔ مشمولہ خیالات عزیز۔ مرتبہ منشی دیا نرائن نگم۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء۔
ہاشمی، نصیر الدین۔ "امجد حیدرآبادی"۔ مشمولہ نقوش لاہور شخصیات نمبر اوّل (جنوری ۱۹۵۶ء)۔
______۔ "امجد حیدرآبادی"۔ مشمولہ یادگار امجد۔ مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی۔ حیدرآباد دکن: مطبع ابراہیمیہ، ۱۹۶۴ء۔
______۔ "مقدمہ"۔ مکتوبات امجد۔ مرتبہ نصیر الدین ہاشمی۔ حیدرآباد دکن: شمس المطابع، ۱۳۳۵ھ۔